لمحوں کا دُکھ

"احمد فراز کے انجام کو
مدِّ نظر رکھتے ہوئے، کوئی
سر پھرا ہی اس کتاب پر
اظہار رائے کی جسارت کر
سکتا ہے۔"

(ڈاکٹر عبادت بریلوی)

قیمت: ۵ا روپے

لمحوں کا دُکھ

بالی جی

لوک کلا پبلیکیشنز ——— لاہور

احاطہ اسلام دین - لنڈا بازار

پبلشرز ——— رفیق رابی

پرنٹرز ——— فرینڈز آرٹ پریس

کتابت ——— رشید احمد آزاد

آرٹسٹ ——— ایچ اے جی ایڈورٹائیزرز

تعداد ——— ایک ہزار

پہلا ایڈیشن

لمحوں کا دُکھ

صدیوں کے نام!

لوگ کھاتے ہیں خوف درپن سے
ہم نے کاہے کو شاعری کرلی

مِل کے ہم سے نہ جان پایا کوئی
سب میں شامل ہیں، پھر بھی تنہا ہیں

جس نے گھر کو کبھی لوٹنا ہی نہیں
کون دیکھے گا ایسے مسافر کی راہ

ترتیب

مصلوب نسل کا شاعر

جب رات بھیگ جاتی ہے اور ایک ایک کر کے دُکانیں بند ہونے لگتی ہیں۔ لوگ گھروں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور سڑکیں یوں ویران ہو جاتی ہیں، جیسے کبھی آباد نہ رہی ہوں ـــ تو ایک عجیب سی اداسی پرانے شہر کی تاریک گلیوں سے نکل کر چاروں طرف بہنے لگتی ہے۔ پھر ہانپتی سڑکوں کے کنارے محض میونسپلٹی کے الیکٹرک پولز مردہ روشنی بکھیرتے، برہنہ کھڑے سسکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور آخری تاریخوں کا زرد چاند، اونچی اونچی نیم تاریک بلڈنگوں پر چمکتا ہے اور ہوا یوں بَین کرتی چلتی ہے جیسے سنسان سڑکوں کا نوحہ پڑھ رہی ہو۔

اس سمے کبھی آپ کا لاہور کی ویران سڑکوں پر گذر ہو، تو دُور دُور تک بیوہ کی مانگ کی طرح اجڑی سڑک کے کسی تاریک موڑ سے اچانک ایک نقطہ سا رینگتا، آپ کی طرف آتا ہُوا دکھائی دے گا۔ جو بڑھتا، لہراتا ڈولتا ایک کمزور سے انسانی ہیولے میں مُتشکّل ہو جائے گا۔ اور قریب آنے پر آپ جس کے چہرے پر بیتے لمحوں کا دُکھ آسانی سے پڑھ لیں گے۔ اس کی ویران آنکھوں کی بُجھتی جوت آپ کو اداس کر دے گی اور جس کے شعر سُن کر انسانی دُکھوں، حسرتوں اور آرزوؤں کی ایک پوری دنیا آپ کے سامنے برہنہ ہو جائے گی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ شخص آپ کو جانا پہچانا سا لگے جس کے اُلجھے ہوئے کپڑوں پر کسی پارک کی سوکھی گھاس کے تنکے اٹکے ہوئے ہوں گے۔ بال خشک اور پریشان ہوں گے۔ جلتی آنکھوں میں اندیکھے سپنوں کی راکھ لئے، جو آخرِ شب کی تیز ہواؤں میں سوکھے پتے کی طرح بے بس اور مجبور نظر آئے گا۔ لیکن اس کے خشک ہونٹوں

پر پیاسی مسکراہٹ کی دراڑ میں سے معصومیّت کچھ اس طرح سے جھانکے گی کہ ایک تیز ، سرد لہر پورے وجود میں گھومتی ، سرسراتی ، چکر لگاتی ، آپ کے رونگٹوں میں کھڑی ہو جائے گی۔

ہاتھ میں سلگتا سگریٹ اور ہونٹوں پر اشعار کی کجلائی ہوئی قندیل لئے یہ شخص —— یقین کیجئے ، یہی باقی جی ہے۔ جس نے دن کی روشنی چھوڑ کر ، رات کے گنجان اندھیروں کو اپنے وجود کے گرد کمبل کی طرح لپیٹ لیا ہے۔ جس کے اشعار سُن کر آپ باوجود کوشش کے بھی ، ہنس نہ پائیں گے اور لاکھ جتن کرنے پر بھی رو نہ سکیں گے۔ کیونکہ انسانی دکھوں اور محرومیوں کی چوکھٹ چوکھٹ گڑھی صلیبوں پر صرف باقی جی ہی نہیں۔ آج ہماری پُوری نوجوان نسل مصلوب ہے اور باقی جی اسی مصلوب نسل کا حساس شاعر ہے۔

باقی جی سے میری پہلی مُلاقات خاصے عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ اُن دنوں وہ محض اقبال بٹ تھے اور دوستوں کے حلقے میں " ایبسنٹ مائنڈڈ پروفیسر" (ABSENT MINDED PROFESSOR) کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ اپنے اچھے خاصے وسیع علم کے بل بوتے پر وہ میرے احباب کو ناک چنے چبوایا کرتے تھے۔ ان کی تعریفیں سُن سُن کر جب بقول شخصے میرے کان پک گئے تو ایک دن دوستوں نے پکڑ کر ملاقات کرا دی۔

پہلی نظر میں وہ مجھے ایک کالج کے عام سے طالب علم دکھائی دیئے (حقیقتاً وہ ان دنوں کالج میں پڑھ رہے تھے) جو کالج سے بھاگ کر فلم کا اسپیشل شو دیکھنے کی بجائے ، دوستوں میں بیٹھا سیاسیاتِ عالم پر لیکچر ہانک رہا ہو۔ ظاہری حلیہ خاصہ " ٹھیک ٹھاک " تھا۔ مگر اُن کی ہر حرکت اور انداز چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ کسی کی زیادہ پرواہ کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ یہی لاپرواہی اور لااُبالی پن بچپن ہی سے ان کی شخصیت کا جزو رہا ہے۔ جہاں اس نے کبھی کبھار انہیں فائدہ بھی پہنچایا ، وہاں نقصان بھی۔ اب تک اُن کی گمنامی میں اس عادت قبیحہ کا بھی پورا پورا ہاتھ ہے

اسی ملاقات میں پتہ چلا کہ شعر و ادب سے بہت لگاؤ ہے۔ ترقی پسند ادب تو انہوں نے جیسے گھوٹ کے پی رکھا ہے۔ ساحر اور کیفی اعظمی سے شدید متاثر تھے۔ اچھی طرح یاد نہیں شاید انہوں نے ان شعراء کا تازہ کلام بھی سنایا تھا۔ خود ابھی شعر کہنے شروع نہ کئے تھے تاہم چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنے کے خبط میں مبتلا تھے۔ جو بدقسمتی سے کبھی چھپ نہ سکیں (وہی لاپروائی اور لاابالی پن) مگر چند کہانیاں جو میں نے اُن کے منہ سے سُنیں ، ان میں لفظوں کی جرأت اور امیجری نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اور مجھے احساس ہُوا۔ کہ یہ چھریرا سا عقابی ناک والا لڑکا

اپنے جسم میں ایک شاعر کی رُوح رکھتا ہے۔

اس اچانک ملاقات کے بعد باقی جی سے اکثر ملاقاتیں رہتیں۔ اگرچہ ہم ابھی ان حدوں تک نہ پہنچے تھے جہاں سرسری ملاقاتیں اٹوٹ دوستی کے بندھن میں بندھ جاتی ہیں۔ تاہم آثار بتاتے تھے کہ ہم زیادہ عرصہ اس عبوری دور میں گرفتار نہ رہ سکیں گے۔ کیونکہ باقی جی خطرناک حد تک میرے ہم خیال تھے۔ ادب سے لیکر سیاست تک ہمارے نظریات کم و بیش ایک جیسے تھے۔ اور یہی خطرناک ہم خیالی، ہمیں نظریاتی سطح پر ایک کر گئی۔

ان دنوں میں نے سیاست میں نیا نیا حِصّہ لینا شروع کیا تھا۔ اور میرا رجحان چونکہ بائیں بازو کی طرف تھا چنانچہ قدرتی طور پر اس وقت کی واحد بائیں بازو کی پارٹی، "نیشنل عوامی پارٹی" میں شامل ہو گیا، بالی جی گو کسی سیاسی پارٹی میں شامل نہ تھے۔ تاہم وہ کالج میں یونین سازی اور اسی قسم کی دوسری سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا کرتے تھے —— پاک بھارت جنگ کے بعد جب "اعلان تاشقند" کا سوال اٹھا، تو نیشنل عوامی پارٹی دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ اگرچہ تضادات پہلے سے موجود تھے، جو خاصی سنجیدہ صورت اختیار کر گئے تھے۔ تاہم "اعلان تاشقند" اور بین الاقوامی سطح پر چین اور روس کی چپقلش نے بنیاد کا کام کیا اور پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی۔

ان دنوں ہم منے نئے سیاسی کارکن، رومانیت کی حد تک بائیں بازو اور اس کی سیاسی پارٹی کے قیام کے خواہاں تھے۔ چنانچہ اس ٹوٹ پھوٹ سے کم از کم میں شدید دل برداشتہ ہُوا اور سب کچھ چھوڑ کر گھر میں بیٹھ گیا۔ پھر تقریباً ایک برس تک سوائے لکھنے پڑھنے کے کسی طرف توجہ نہ دی۔ اس بے کاری کے زمانہ میں "حلقہ ارباب ذوق" اور ٹی ہاؤس میں متواتر بیٹھنے سے کچھ نئے دوستوں سے تعارف ہُوا، تعارف کروانے والوں میں بالی جی پیش پیش تھے۔ پھر میں اور بالی جی ایک ساتھ سیاسی میدان میں کُودے اور اُسی زمانے میں اس دوستی کی بنیادیں پڑیں جو آج تک قائم ہیں۔

وہ دور ہمارے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ میرے لئے اس طرح کہ اُسی دور میں میں نے سنجیدگی سے اپنی آئندہ زندگی کا لائحہ عمل طے کیا اور بالی جی کے لئے یوں کہ اُسی دور میں باقی جی نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور اپنی پہلی غزل کہی، جو اسلامیہ کالج کے مجلّہ "فاران" میں طبع بھی ہوئی۔ جس کا مطلع ہے ؎

برف سے اٹھتے ہوئے شعلوں نے دی ہم کو خبر
پھر کوئی سورج اٹھا اور پھر کہیں ابھری سحر

اُس دور میں باقی جی عملی سیاست میں بہت گہرے اتر گئے تھے۔ دن رات سیاسی کام نے انہیں عملی طور پر

وہ طبقاتی بُعد دکھایا، جس کو وہ محض کتابوں سے پڑھ کر سمجھے تھے، مظلوم طبقوں کی حالت زار باقی جی جیسے حساس نوجوان کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوئی اور انہیں اپنے فلسفۂ حیات پر پہلے سے زیادہ یقین اور ادراک حاصل ہُوا۔ چنانچہ ان کی ابتدائی شاعری میں ہی اس ظلم اور جبر اور اس کے خلاف سینہ سپر ہونے کی آرزو جھلکتی نظر آتی ہے ؎

دُھند کے پیچھے چھپی ہر چیز واضح ہو گئی
جبر کے بڑھتے ہوئے احساس کا کچھ ہے اثر
دیکھ لو تم بھی تماشا رات کی تاریکیو!
آگ کی لہروں میں آکر بہہ چلا ظلمت نگر

باقی جی پر شاعری کا خروج ایک دم نہیں ہُوا، ابتداء میں تو محض ایک آدھ غزل ہی ہوا کرتی تھی۔ جسے وہ اپنے دوستوں کے گوش گذار کر کے جیسے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جایا کرتے تھے۔ شروع میں تو وہ بھی خود کو شاعر نہیں کہتے تھے۔ مگر پے در پے پھر غزلیں ہونے لگیں تو انہوں نے بھی سنجیدگی سے اس طرف توجہ کی اور رفتہ رفتہ پڑتی پھوار کی طرح وہ اشعار کے ترنم میں ڈوبتے چلے گئے۔ ویسے بھی عام شاعروں کی طرح انہوں نے کبھی خود پر جبر کر کے شاعری نہیں کی۔ بلکہ شعر اس وقت کہا، جب خیالات نے لفظوں میں اور لفظوں نے شعر کے قالب میں ڈھلنے کے لئے انہیں مجبور اور انگیخت کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی دور کی شاعری خاصی مختصر ہے۔ کبھی کبھار کوئی واقعہ، کوئی جذبہ یا کوئی سانحہ انہیں مجبور کرتا تو وہ شعر کہہ دیتے تھے۔

مجھے یاد ہے ایک دن پڑھانے کے بعد (ان دنوں ہم نے ایک ٹیوشن سنٹر قائم کر رکھا تھا) ہم فارغ ہوئے تو یک لخت اُن پر ایک شعر کا نزول ہُوا، شعر یوں تھا ؎

کھو گئے جال میں میرا اپنا لہو، زندگانی کے ریشوں سے کٹتا گیا
سوز احساس نے جب جگایا مجھے، زرد چہرے کا ہالہ سمٹتا گیا

انہوں نے شعر چاک سے بلیک بورڈ پر لکھ دیا۔ میں نے کافی زور دیا کہ غزل پوری ہو جائے، مگر باوجود کوشش کے غزل آگے نہ چل سکی۔ آمد مکمل طور پر بند ہو گئی تھی۔ پھر یہ غزل بہت عرصے بعد ۶۸ء میں مکمل ہوئی۔ شاید ۶۸ء کی آمریت دشمن تحریک نے ان کے ذہن کو مواد بہم پہنچایا تھا۔

باقی جی عموماً رات کو شاعری کرنے کے عادی ہیں۔ کسی ویران پارک کے چپ چاپ گوشے میں یا موسیقی سنتے ہوئے ان پر شعر اترنے لگتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہُوا ہے کہ طبیعت موزوں نہیں ہوئی اور تمام رات آوارہ

گردی میں گذر گئی، لیکن ایک شعر بھی نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ رات بھیگنے سے پہلے ہی غزل مکمل ہو گئی ہے۔ اور دوسری غزل کے اشعار اترنے شروع ہو گئے ہیں۔ کسی کسی رات تو دو غزلیں ایک نظم اور ایک آدھ گیت لے کر وہ واپس گھر لوٹے ہیں۔ مگر ایسا موقع شاذ ہی نصیب ہوا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، باقی جی کی ابتدائی شاعری ایک تو بہت کم تعداد میں ہے۔ دوسرے ان کی لاابالی طبیعت نے غزلوں اور نظموں کو سنبھالنے کے سلسلے میں انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ جس کی وجہ سے اُن کی ابتدائی تقریباً تمام تخلیقات ضائع ہو گئیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس زمانے میں وُہ خود کو شاعر مانتے ہی نہ تھے بہر حال ایک آدھ غزل یا نظم ہی آج ملتی ہے۔ جنہیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس وقت بھی شاعر میں شدت احساس اپنی تمام ترجدّت اور ندرت کے ساتھ موجود تھا۔ اس دور کی نظم "لمحوں کا دُکھ" اس کی شاہد ہے ؎

ایک لمحہ،
کئی صدیوں میں بکھر جاتا ہے،
جب کبھی گذری ہوئی کل کا خیال آتا ہے،
کل!
کہ دامن میں چھپائے ہوئے مُردہ لمحے،
وقت کی قبر میں دفنا کے جنہیں بھول گئی
برف کے کوہ بنے اُبھرے ہیں۔
آج کے سینے پہ ہیں،
مرتے ہوئے چاند کی لاکھوں کرنیں،
یاس و امید کے سنگم پہ کھڑی سوچتی ہیں،
صبح کی پہلی کرن
ان کا جنازہ ہو گی!!

باقی جی کی کم و بیش تمام شاعری، سیاسی صورتِ حال کے ساتھ اس طرح پیوست ہے کہ دونوں کو ایک دُوسرے سے جدا کر کے دیکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ "لمحوں کا دُکھ" باقی جی نے اس وقت لکھی تھی، جبکہ ایوبی آمریت کا دم گھونٹنے والا جمود آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا تھا۔ اور ایک تحریک کے ابھرنے کی علامتیں ظاہر ہونا

شروع ہوگئی تھیں۔ لوگ یاس و امید کے سنگم پر کھڑے تھے۔ صرف ایک پتھر کی ضرورت تھی، جو اس ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلچل مچا سکے۔ پھر جب آمریت دشمن تحریک کا سیل رواں اُمڈا تو بالی جی نے نہ صرف اس میں عملی طور پر حصّہ لیا۔ بلکہ اپنے اشعار میں بھی جابجا اس کا واضح اظہار کیا ؎

برف کے شہر پر اتنے سورج گرے، کُو بہ کُو پھیل کر لوگ طوفاں بنے
دیکھ کر یہ سماں، ظلم کا ہر نشاں، اپنے مآخذ کی جانب پلٹتا گیا
ظلمتوں کا نگر، فاصلوں کی ڈگر، ہر طرف، ہر جہت حسرتوں کا زہر
پی کے اس زہر کو، عصر کے قہر کو، بانجھ نسلوں کا سینہ بھی پھٹتا گیا

پھر پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک نیا موڑ آیا۔ ایوب دشمن تحریک کے دوران ہی "پاکستان پیپلز پارٹی" ایک طاقتور سیاسی قوت بن کر ابھری، بائیں بازو کے دوسرے لوگوں کی طرح بالی جی نے بھی طبقاتی شعور دینے کے کام کا آغاز کر دیا وہ دور بڑی ہنگامہ آرائی کا دور تھا۔ جلسے، جلوس، لاٹھی چارج، مظلوم عوام پاکستان بھر میں سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ جگہ جگہ دفتر کھل رہے تھے، دفتر بند ہو رہے تھے۔ بالی جی بھی اپنے حصّہ کا کام کرنے میں منہمک تھے۔

مگر اسی دور میں چند ایک ایسے حادثات رونما ہوئے، جنہوں نے نہ صرف بالی جی کی زندگی، بلکہ انکی شاعری پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اور انہیں واقعات کی بدولت بالی جی کی سیاسی وفاداریاں مشکوک ہوگئیں۔ جن ساتھیوں کے ساتھ بالی جی دن رات مزدوروں اور طالب علموں میں سیاسی کام کرتے رہے تھے۔ اُن سے ایک دم قطع تعلق سا ہوگیا۔ دونوں طرف سے اشتعال انگیز باتیں ہوئیں۔ اور بالی جی یک لخت اس بھرے شہر میں اچھوت قرار دے دیئے گئے، شاید بالی جی کی زندگی میں یہ پہلا بڑا حادثہ تھا۔ جس نے انہیں اپنے ہی لوگوں میں اجنبی اور بے گانہ بنا دیا۔ وہ کافی عرصے تک تنہا ہی سیاسی میدان میں اپنی آبلہ پائی کا نظارہ کرتے رہے۔ ان کا دوستی اور دوسراتھ کے لفظوں پر سے ایمان اٹھ گیا۔ اور وہ تیزی سے موضوعیت پسندی کی طرف چل پڑے۔ اس مقام سے بالی جی کی شاعری کا وہ دور شروع ہُوا۔ جس کی زیادہ تر غزلیں، داخلیت پسندی کی مظہر ہیں۔ جس میں شاعر خود اپنی ہی ذات سے مخاطب ہے اور اپنی ہی سوچوں کی ٹوٹی ہوئی بے ترتیب کرچیوں کو نئے سرے سے جوڑنے میں محو نظر آتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے ؎

اداس لمحوں کا ہمسفر ہوں — خود اپنی ہستی سے بے خبر ہوں
مقام عبرت نہ بن سکی جو — شکستہ نسلوں کی وہ خبر ہوں

(۱۷)

آبادی میں بکھرے ہوئے ویرانوں کا گھر ہوں
خود اپنی ہی الجھی ہوئی سوچوں کا اثر ہوں
دیکھا نہیں صدیوں سے کوئی بھٹکا مسافر
ابلاغ کو جاتی ہوئی اک راہ گزر ہوں
جو اپنے اندھیروں سے نہ نکلے کبھی باہر
وہ برف میں ڈوبے ہوئے سورج کی سحر ہوں

لوگ تو نفرت کے سورج کی شعاع سے جل گئے
میرا دل تھا جو محبت کا بھی تیشہ سہہ گیا

اس پورے عرصے میں شاعر کی ذات پر ایک اضمحلال طاری نظر آتا ہے۔ اور اسے اپنی تمام جدوجہد لاحاصل اور بے کار نظر آتی ہے اُسے اپنی آرزوئیں، اپنی تمنائیں، اپنے خواب محض سراب نظر آنے لگتے ہیں، جس کا اظہار کچھ یوں ہوتا ہے ؎

حسرتوں سے بھی کھیل دیکھا ہے
ہم نے یہ دُکھ بھی جھیل دیکھا ہے
آرزو کے سراب میں ہم نے
درد بیڑوں کو ٹھیل دیکھا ہے
ہیں خلا ہی خلا مقدر میں
ہم نے سوچوں کو بیل دیکھا ہے
وغیرہ وغیرہ

تاہم اس زمانے میں اِن داخلی اور گھُٹی ہوئی تشنہ سوچوں نے ان کے سیاسی عمل کو نقصان نہ پہنچایا تھا۔ وہ حسب سابق "پیپلز پارٹی" میں سیاسی کام کرتے رہے۔ مایوسیاں تھیں، تنہائیاں تھیں، مگر پھر بھی وہ اس قدر مایوس نہ ہوئے تھے کہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے۔ اپنی تمام تر داخلیت اور لاحاصلیت کے باوجود اُس زمانے میں باقی جی کی شاعری میں امید کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ چاہے وہ کتنی دھندلی اور کمزور کیوں نہ ہوں۔ جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ عمل زندگی اور اس کی رنگارنگی سے ابھی مایوس نہیں ہوئے، یاس کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں، حسرت آمیز ہی سہی مگر زندگی سے پیار کا احساس ہوتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے ؎

گرچہ خوشیاں ہیں ہم سے دُور ابھی
ان سے ہوگا کبھی تو سنگم بھی
کب تلک اور ہم ترستے رہیں
آ بھی جاؤ ہے جانے کو دم بھی

سانس سانس آگ ہو، اب یہی ہے آرزو
میں قفس قفس اجاڑ برف سے نکل گیا
درد کے اندھے پنگھٹ پر جب جیون راہ ٹٹولے
شعلوں کے جھرمٹ میں اترا، ناشادی کیوں چاہے گا
موت کی دیوی جی لے تو بھی بس اب چار گھڑی
خوف کے مندر میں مرجھایا مستعدی کیوں چاہے گا

ظلم کی رات تھی جہل کے روپ میں فرض اپنا بھی لیکن ادا ہو گیا وغیرہ وغیرہ

اور یہی احساسِ فرض اور نظریئے کی کشش تھی کہ باقی جی تنہا سہی، مگر میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ مگر جب پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت میں الیکشن کی طرف رجحان نظر آیا، اور بالآخر ہالہ کانفرنس میں الیکشن کے حق میں ووٹ دے دیا گیا۔ جس کی بنا پر آمریت دشمن تمام عوامی اخبار "پرچی" کی نظر ہو گیا۔ تو دوسرے مخلص کارکنوں کی طرح باقی جی بھی بددل ہوئے۔ یہ بات درست ہے کہ باقی جی کو پیپلز پارٹی کے طبقاتی کردار سے مکمل واقفیت تھی اور وہ اس قسم کے نام نہاد جمہوری اقدام سے بھی بے خبر نہ تھے تاہم یہ ناکامی اور احساسِ شکست، ان داخلی الجھنوں اور تشنہ سوچوں کو ابھارنے اور سطح پر لانے کے لئے بنیاد بنا اور باقی جی پر یک لخت مایوسی کے تاریک بادل یلغار کر آئے۔

پرانے دوستوں سے کٹ کر اور اس بے رحم داخلیت سے گبھرا کر باقی جی نے نئے دوستوں کے ساتھ کام کرنا قبول کیا اور نئے سرے سے سنبھالا لیتے ہوئے طالب علموں میں مصروف ہو گئے، مگر بنگلہ دیش کا مسئلہ یہاں بھی اختلاف کا روپ دھار گیا۔ اور یہ سیاسی اختلاف بالآخر باقی جی کی دوستوں سے قطع تعلقی پر منتج ہوا،

ہمارے ہاں دراصل بدقسمتی سے سیاسی اختلاف، ذاتی اختلاف کا روپ دھار لیتا ہے۔ جس سے بجائے فائدہ کے ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ چنانچہ اس علیحدگی نے باقی جی کو سخت بے چین کیا اور وہ ذات کی ان تاریک گپھاؤں میں اتر گئے، جہاں اداسی، محرومی اور کرب کے زہریلے دھوئیں نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہیں سے ان کی شاعری میں خود اذیتی اور قنوطی ذریعہ اظہار راہ پاتا ہے۔ جس نے بڑھ کر باقی جی کی تخلیقی قوتوں کو نرغے میں لے لیا اور ان پر لاحاصلیت کا رنگ مزید گہرا اور گھنا ہو گیا۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

دیکھ کتنا لرزاں منظر ہے ٹوٹتے پاؤں سامنے گھر ہے

کون پوجا کے پھول لائیگا زندگی اک اجاڑ مندر ہے

غم کی دہلیز پر ہوئے چھلنی یہ نہ جانا کہ کانچ کا در ہے

سلگتی سانسوں کی آنچ لے کر خوشی کی راہوں پہ چشم تر ہوں

چلو بھلا دو میرا فسانہ کہ بیتے کل کا گیا پہر ہوں

چاندنی بانٹتا، چاند بھی تھک گیا
میرے آنگن میں پھر بھی اندھیرا رہا
ایک بھی آنکھ جگ میں نہ پرنم ہوئی
اتنی عظمت سے میرا جنازہ اٹھا

(۱۰)

گھر کے دروازے اجنبی سے لگیں
اپنی پہچان کھو گئے ہم بھی
کون کھائے فریب صبحوں کے
آج اندھے ہوئے ہیں انجم بھی

(۱۱)

اجڑے ہوئے سینے میں بھی ارمان تھا کبھی
صحرا میں ڈھل گیا ہے جو طوفان تھا کبھی
محرومیوں کے تیر چلاؤ گے اب کہاں؟
پتھرا گیا وہ شخص جو انسان تھا کبھی
خود چیخ بن گیا ہے جو اپنے وجود کی
تیرے گلاب ہونٹوں کی مسکان تھا کبھی

وغیرہ وغیرہ

یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ جہاں داخلیت اپنے پاؤں جماتی ہے۔ وہاں سے عقل و خرد رخصت ہو جاتی ہے اور محض جذباتیت کا دور دورہ نظر آنے لگتا ہے۔ اور یہ بھی داخلیت ہی ہے جو اپنی انتہائی صورت میں ابلاغ کو مسخ کر دیتی ہے اور ذریعہ اظہار میں ابہام اور ایمائیت کا رنگ بھرتی ہے۔ مغربی شاعری میں ملارمے اور بادلیئر اس کی واضح اور اہم مثالیں ہیں، "شگوفہائے شر" میں بادلیئر کی قنوطیت مریضانہ حد تک پہنچ گئی ہے اور ملارمے میں یہی داخلیت ذریعہ اظہار کو اس قدر پیچیدہ اور مبہم کر دیتی ہے کہ بعض اوقات قاری سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔ مگر شاعر جو کہنا چاہتا ہے اس تک رسائی نہیں ہو پاتی۔ اردو شاعری میں میراجی اسی جذباتیت اور قنوطیت کے علم بردار ہیں۔ ان میں بھی داخلیت ابہام اور ایمائیت کے ایسے رنگ دکھاتی ہے کہ پڑھنے والا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے، اور ہزار کوشش کے بھی کچھ پلے نہیں پڑتا — بالی جی کی داخلیت ذرا مختلف قسم کی ہے۔ وہ اتنی پیچیدہ مبہم اور دور از کار نہیں ہے کہ مفہوم خبط ہو کر رہ جائے تاہم ان کے ہاں بھی داخلیت کے آتے ہی عقل و خرد رخصت ہو گئی۔ اور ان کی جگہ محض جذباتیت نے لے لی۔ جس کی بنا پر اشیاء اور ان کے مظاہر دھندلے دھندلے اور ناقابل فہم ہو کر رہ گئے۔ مثال کے طور پر "پیپلز پارٹی" کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے ان کا رویہ پارٹی کے معاملے میں سائنٹفک تجزیے سے زیادہ جذباتی ہو گیا ہے، دوسری طرف وہ بائیں بازو کے عدم اتحاد سے نالاں ہیں۔ لیکن اس توڑ پھوڑ کے حقیقی اسباب کی نشان دہی کرنے کی بجائے، محض جذباتی باتوں پہ اکتفا کرتے ہیں اور ان تلخ حقائق کو اسباب

کی حقیقی روشنی میں رکھ کر پرکھنے کی بجائے، صرف اپنی ذات کے حوالے سے انہیں بیان کر دینے کو ترجیح دیتے ہیں -
چند مثالیں دیکھئے -

؎

دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا — شمس اندھا ہوا دن سیاہ ہو گیا
ہم اندھیروں میں اب بھی بھٹکتے ہیں کیوں — صبح کا تارا تو کب کا فنا ہو گیا

اور

میں نے کب کہا سجن رات غم کی کٹ گئی — آ کے میرے دوار سے روشنی پلٹ گئی
کیا کہوں میں ساتھیا! رائیگاں کی دھوپ جو — ڈس کے میری خواہشیں کرچیوں میں بٹ گئی

اور

نویدِ صبح کی بشارت کچھ اس طرح سے ملی — ستم کی آنچ پہ ہر فرد تھا پگھلتا ہوا
جنوں کی راہ میں ہم تو تھکے نہیں تھے مگر — کسے کہیں کہ رکا وقت ساتھ چلتا ہوا

اور

کچھ اس طرح کا ہم کو تماشا دکھا گیا — شعلوں کو کوئی برف کا پیکر بنا گیا
ہم کھوکھلے سے لوگوں سے جا کر کہیں تو کیا — خالی تھا وہ بھی شخص جو محفل پہ چھا گیا

اور

عصر کے زہر میں نہائی ہے — ویسے کہنے کو صبح آئی ہے
کاٹ کر سر بنا لیا کاسہ — پھر بھی مرنے کی بھیک پائی ہے

وغیرہ وغیرہ

اک طائرانہ نظر ہی ڈالیں، تو یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ باقی جی کی شاعری کا یہ درمیانی دور (اسے عبوری دور بھی قرار دیا جا سکتا ہے) خارجیت سے داخلیت تک کا پُرخطر سفر ہے۔ اس سفر میں ان کے ہاں امید سے زیادہ مایوسی اور سرخوشی کے احساس سے زیادہ کرب کا رنگ غالب ہے۔

اسی دور میں جب باقی جی خود کو راہِ وفا کا تنہا مسافر سمجھ رہے تھے ایک اور دلخراش حادثے نے انہیں حواس باختہ کر دیا۔ یہ حادثہ ان کی والدہ کی ناگہانی موت کی صورت میں وقوع پذیر ہوا اور یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ باقی جی

جیسے حساس شاعر کے لئے، جسے زندگی پہلے ہی کافی زخمی کر چکی تھی۔ والدہ کا یوں یک لخت چھن جانا، آخری سہارے کا چھن جانا تھا۔ سرد مہریٔ ارباب وطن سے نڈھال باکی جی کو صرف یہی ہستی بار بار احساس دلایا کرتی تھی کہ وہ اب بھی کم از کم ایک شخصیت کی نظروں میں محترم ہیں۔ کسی ایک فرد کو اب بھی ان کا انتظار رہتا ہے اور زندگی کو اب بھی ان کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درمیانے دور کی ابتدائی شاعری میں جہاں مایوسی اور تنہائی کا زہریلا احساس انہیں بے چین رکھتا تھا۔ وہ زندگی سے مایوس نہ ہوئے تھے۔ انہوں نے ٹوٹ کر کبھی موت کی خواہش نہ کی تھی۔ بلکہ انتہائی مایوس غزلوں میں بھی ایک آدھ شعر اچھے دنوں کی آمد کا مژدۂ جانفزا سناتا نظر پڑ جاتا تھا۔ جن دنوں ان کی والدہ بیمار تھیں۔ وہ امید اور ناامیدی کے سنگم پر کھڑے نظر آتے تھے۔ کبھی خاصے رجائی اشعار کہنے لگتے تھے اور کبھی انتہائی قنوطی غزلیں کہہ دیتے تھے۔

اُن دنوں انہیں صرف ایک " PUSH " کی ضرورت تھی، جو انہیں واپس ہنستی کھیلتی زندگی اور اس کی رنگا رنگی کی طرف بھی لا سکتی تھی۔ اور انہیں مایوسی کی اتھاہ تاریکیوں میں بھی دھکیل سکتی تھی۔ والدہ کی ناگہانی موت اور خارجی دنیا کی ابتر حالت نے " PUSH " کا کام تو کیا مگر منفی انداز میں اور وہ تنہائی، تاریکی اور دم گھونٹ دینے والی لاحاصلیت کے غاروں میں گر گئے۔ اس دور میں پہلی مرتبہ انہوں نے خلوص دل سے موت کی خواہش کی، اس زمانے کی شاعری میں ایک ایسے تنہا شخص کی دلخراش چیخیں صاف سنائی دیتی ہیں، جسے تاریکی اور کرب کی پیچ در پیچ راہوں سے باہر نکلنے کا راستہ سجھائی نہیں دیتا اور وہ وہیں تنہائی کے زہر میں بھیگا کراہ رہا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ہر طرف چیختے ہیں سناٹے — شہر یہ ہم نے بسلائے یارو
گھر کے آنگن سے اندھیرا نہ گیا — داغ دل کے بھی جلائے یارو
زندگی رکن کا مقدر ہو گی — ہم پہ تو موت کے سائے یارو

حسرتوں کا مزار مت پوچھو — اجڑے لوگوں کا کوئی شہر نہیں
زندگی نے ہمیں سکھایا یہی — غم کے آنے کا کوئی پہر نہیں

حسرتو! اس بدن کی بستی میں — تم رہو میں ہی نکل جاؤں گا
مجھ کو شعلوں میں پڑا رہنے دو — برف کا در ہوں پگھل جاؤں گا
کون سانسوں کا قفس چاہے گا — میں تو پتھرا کے بہل جاؤں گا

کیا کہیں سانسوں کا اپنی مدعا — ڈھونڈتے ہیں زندگی کا راستہ
ہونٹ میرے اک ہنسی کی آرزو — آنکھ اجڑے منظروں سے آشنا
اپنی سوچوں کی حقیقت کیا کہیں — دل میں ریزہ ریزہ کوئی خواب تھا

مسکراہٹوں کا رنگ اس قدر مچل گیا — میں پلک پلک تلک آنسوؤں میں ڈھل گیا
آج کیوں صدائیں دوں رحم کے خداؤں کو — میرا اعتقاد تو حرف حرف پگھل گیا

چھا گئی زیست پہ کچھ ایسی ہی شام — کرچیاں ہو کے لہو بنتا گیا ہاتھ میں جام
راکھ ہو کر ہی بکھر جائیں فضائیں یارو! — شہر پرشور میں قبروں کا نہیں کوئی مقام

وغیرہ وغیرہ

باقی جی کی شاعری کا درمیانی دور صوفیانہ استغراق کا دور ہے۔ اس دور میں وہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان ایک بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز راستے پر ڈولتے، لہراتے، بکھرتے اور سمٹتے بڑھتے رہے۔ اس قسم کی از خود رفتگی میں خارج سے محض برائے نام تعلق رہ جاتا ہے۔ تمام رشتے، تمام بندھن، توہمات معلوم ہوتے ہیں۔ ہر چیز کا مفہوم صرف اور صرف داخلی واردات کے حوالے سے تشکیل پاتا ہے۔ اور اشیاء فی الذاتہ کوئی حقیقت نہیں رکھتیں بلکہ محض پرچھائیاں بن جاتی ہیں۔ اور انسان پر ایک مجہول سی بے حسی غلبہ پا لیتی ہے۔

یہی بے حسی اس دور میں باقی جی پر بھی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ انہوں نے سیاسی کام ترک کر دیا تھا۔ وسیع حلقۂ احباب سمٹ کر چند قریبی دوستوں تک محدود ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ اپنی ذات میں یک و تنہا تھے صبح حسب معمول گھر سے نکلتے اور تمام دن جلتا سورج انہیں مختلف کالجوں، پارکوں اور ہوٹلوں میں سایہ سایہ بھٹکتا دیکھتا اور تھک کر

مغرب میں منہ چھپا لیتا۔ شام اتر آتی، راستے دھندلا جاتے، مگر بالی جی گھر کو لوٹنے والے راستے سے کترا کر ان راہوں پر ہو لیتے، جو آباد شہر کے ویرانوں کی طرف جاتی تھیں۔

پھر ایک ایک کر کے روشنیاں بجھ جاتیں، ہنگامے دم توڑ جاتے، رات بھیگ جاتی اور رات کے پچھلے پہر کی تیز ہوا اونچی اونچی بلڈنگوں پر اوپر ہی اوپر چنگھاڑنے لگتی۔ اس وقت بالی جی شہر کے کسی تاریک اور ویران کونے سے برآمد ہوتے، پھر لڑکھڑاتے، ڈولتے، گرتے پڑتے، خراماں خراماں گھر کی طرف چل دیتے، تازہ غزل کے زخمی اشعار اُن کے ہونٹوں پر پھڑ پھڑاتے اور اس طرح سنسان سڑکیں انہیں گھر تک چھوڑ کر پلٹ جاتیں۔

یہ دور بالی کی شاعری میں تاریک ترین دور ہے۔ اس دور میں انہیں ہر طرف دکھ، اداسی اور بے حسی کے عفریت نظر آتے ہیں۔ تنہائی اور داخلی بے چینی نے ان پر ایک مجذوبانہ علیحدگی پسندی طاری کر دی تھی۔ جس کے حوالے سے وہ جمود اور چپ کی شاعری کرنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ آخری سہارا یعنی نظریاتی وابستگی بھی دم توڑ گئی تھی۔ اور اچھے دنوں کی خواہش اور صبح کی روشنی بھی بے معنی نظر آنے لگی تھی۔ جسکا اظہار ان کے اشعار میں کچھ اس طرح ہوتا ہے۔

کیا ملے گا ہمیں سویروں میں — روشنی کھو گئی اندھیروں میں
گھر کو لٹوا کے یہ سنا۔ یارو! — ہم بھی شامل رہے لٹیروں میں
زندگی کے نگر میں آئے کون — خاک اڑتی ہے یاں بسیروں میں

اور

زندگی ہی میں مر گئے ہم لوگ — کیا کہیں خود سے ڈر گئے، ہم لوگ
درد کی آڑی ترچھی راہوں میں — ایسے سمٹے بکھر گئے، ہم لوگ
ڈھونڈنے پر نشان بھی نہ ملا — آج ہی اپنے گھر گئے، ہم لوگ

اور

جیون دکھ پر بانجھ رُتوں کی برساتیں — ہم نے دیکھیں ظالم صبح کی برکاتیں
لوگ دیوانے نعروں میں آباد ہوئے — بھول گئے غم کی کالی گہری راتیں

اور

برف کا شہر اور میری چُپ — آس کی لہر میں گھنیری چُپ
بات کرنی کسے نہیں آتی — لُوٹ کر لے گئی اندھیری چپ
سامنے آئے موت میں اترے — آج کے پہر میں دلیری چپ

ان دنوں جب باقی جی اس قسم کی یاس انگیز شاعری کر رہے تھے۔ چند دوستوں نے مل کر "الصوفیا" قائم کی اور باقی جی کو دعوت دی کہ وہ وہاں اپنی تخلیقات پڑھا کریں۔ اُس زمانے میں باقی جی اپنی موضوعی شاعری کے نقطۂ عروج پر تھے۔ چنانچہ باقی جی نے "الصوفیا" میں جو پہلی غزل پڑھی وہ موضوعی کرب اور مایوسی کا شاہکار تھی، اس غزل کے صرف دو شعر یاد رہ گئے ہیں ۔ ؎

ذہن ہی جب بن چکے ہوں بانجھ کھیت — فصل لاشوں کی جو بوئیں بھی تو کیا
آب میں ڈھل جائے ہر شے جس جگہ — ہم قلم خوں میں ڈبوئیں بھی تو کیا

ساتھیوں نے خلوص نیت اور ہمدردانہ تنقید کی، کئی مقام پر باقی جی اور "الصوفیا" کے دوستوں میں اتفاق رائے ہو گیا۔ باقی جی بھی اس تنقید سے مطمئن ہوئے اور انہیں خوشی ہوئی کہ ان کی تخلیقات کو صحت مند تنقیدی نقطۂ نظر سے پرکھا جاتا ہے۔

پھر باقی جی زیادہ عرصہ یاس انگیز شاعری نہ کر سکے اور اپنے دوست نما دشمنوں کی توقعات کے برعکس انہوں نے اک نیا سنبھالا لیا اور دوبارہ زندگی اور اس کی رنگارنگی کی طرف لوٹنے لگے، اس میں "الصوفیا" کے دوستوں کا بھی نمایاں ہاتھ ہے۔ جو گروہ بندی سے بلند ہو کر صحت مند بنیادوں پر تنقید کرتے تھے اور باقی جی کی نظریاتی کمزوریوں اور داخلی الجھنوں کی نشاندھی کرتے تھے۔ یہیں سے باقی جی کی شاعری کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں وہ مریضانہ داخلیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اس دور کا آغاز اس غزل سے ہوا ؎

ستم کے نگر میں کرا دو منادی — کہ ہم نے چورا ہے میں تربت سجا دی
ہمیں صبر کے راستوں پہ نہ ڈالو — کہ ہم نے مقدر کی بستی اٹھا دی
کہو موت کی شام سے آج نکلے — کہ ہم نے صلیبوں پہ ہستی لٹا دی
ذرا سوچ کر ہم سے آنکھیں ملانا — کہ ہم نے مروّت کی عادت بھلا دی

یہ غزل دراصل باقی جی کی شاعری کے نئے دور کا اعلان نامہ تھا۔ اس میں پہلی بار اس اعتماد کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو باقی جی کی عملی زندگی کا طرّہ امتیاز رہا ہے۔ جو درمیانہ دور کی شاعری میں مفقود نظر آتا ہے۔ اپنی ذات پر دوبارہ اعتماد بحال ہو جانے سے باقی جی میں ایک نئی تازگی، ایک نیا ولولہ ابھرتا محسوس ہوتا ہے اور وہ تیزی سے تنہائی اور یاسیت کے اندھے کنوئیں سے نکلتے نظر آتے ہیں، تا کہ صاف اور شفاف ہوا سے اپنے پھیپھڑوں کو بھر سکیں۔ "الصوفیا" کے ساتھیوں نے ان کی مایوسی، احساسِ شکست اور لاحاصلیت کی ناصرف

نشاندہی کی تھی بلکہ عملی طور پر دوسراتھ ، دوستی اور نظریاتی بندھنوں کو ان میں نئے سرے سے روشناس کرایا تھا۔ اور اہنیں اجتماعی احساس سے بہرہ ور کیا تھا۔ چنانچہ اس نئے دور میں (جو ابھی تک جاری ہے) ان کی تخلیقات پر یاسیت کا رنگ ہلکا پڑنے لگا، اور زندگی کے جملہ مسائل سے مردانہ وار نپٹنے کا کھویا ہوا۔ احساس دوبارہ جاگنے لگا۔

اس دور کو ہم باقی جی کا داخلیت سے خارجیت کی طرف مراجعت کا دور کہہ سکتے ہیں۔ جس میں اہنوں نے موضوع اور معروض کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کا آغاز کیا ہے اور تیزی سے اُس پر قادر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس دور میں اہنوں نے نہ صرف فنی اعتبار سے زیادہ پختہ شاعری کی ہے، بلکہ انقلاب اور تبدیلی پر ان کے ٹوٹے ہوئے یقین کو بھی سہارا ملا ہے۔ جذبے کی شدت، تراکیب کا تنوع اور جدّت جو باقی جی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس دور میں مزید نکھر کر پختہ اور مضبوط ہوا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے ؎

پلکوں کی سنگینیں اٹھاؤ ظلم خداؤں کو تڑپاؤ
برف کے سینے میں سورج ہو کچھ ایسا بھی رنگ جماؤ
آزادی زنجیر ہوئی ہے دار نگر میں دھوم مچاؤ
موت نے سچ کو پھر سے پکارا باقی جی تم توڑ نبھاؤ

(او ر)

آنکھوں میں نراش کے دیئے گو ہیں روشن من میں تو میرے آس کا استھان رہا ہے
دم توڑتے صبح کے ستارے نے خبر دی راتوں کے مقدر میں سویروں کی ہوا ہے

(او ر)

برکھا برکھا نظر ایسے مسکا گئی شعلہ شعلہ جبیں زندگی پا گئی
پتھروں کے بدن میں دراڑیں پڑیں چپ کی آنکھوں میں یوں روشنی آگئی
صبح کی کرنیں سنائیں فسانے نئے رات سورج کے آنگن میں شرما گئی
خوف نے جال نکتوں کے لاکھوں بُنے آگہی سب لکیروں کو بکھرا گئی
موج کی آنکھ میں گاڑھ دو برچھیاں ساحلوں کے نشاں آشتی کھا گئی
بانجھ صدیوں نے ریزہ فصیلیں چنیں خشک بالی کے مکھ پہ نمی چھا گئی۔

یہ درست ہے کہ کوئی تبدیلی یک لخت وقوع پذیر نہیں ہوتی، بلکہ چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کا لامتناہی سلسلہ مل کر ایک بڑی اور وقتی طور پر اہم تبدیلی کو وجود میں لاتا ہے۔ بالی جی بھی یک لخت داخلیت سے گزر کر خارجیت میں نہیں آ گئے۔ بلکہ ایک سفر جاری ہے، جس میں خارجی عوامل جیسے "الصوفیا" کے دوستوں کی تنقید اور دوسرا تھ، ملک کی موجودہ ساز گار سیاسی صورتِ حال اور بالی جی کے ذہن میں غیر محسوس تبدیلیاں۔ اس سفر کی شدت میں کبھی مزید تیزی اور کبھی سست روی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اب بھی اُن پر یاسیت کے دورے پڑتے ہیں اور ان کے اشعار میں مایوسی سرایت کر جاتی ہے۔ اور لہجہ دھیما پڑ جاتا ہے۔ تاہم یہ سفر جاری ہے، بالی جی دوبارہ سیاست میں عملی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ جس نے ان میں اجتماعی نقطۂ نظر کو فروغ دیا ہے۔ اب وہ زندگی کے دکھ سُکھ کو تنہا سہنے کی بجائے مل بانٹ کر برداشت کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ملازمت بھی خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ جو ان کے خود پر اعتماد کی بحالی کی طرف اشارہ کرتی ہے

موضوعیت سے معروضیت اور انفرادی دکھ سے اجتماعی دکھ تک کا سفر اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ جاری ہے اور بالی جی مردانہ وار اُن فاصلوں کو پاٹ رہے ہیں۔ جو ان کی پوری زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے درپے تھی۔ جوں جوں یہ بُعد کم ہوتا جا رہا ہے۔ بالی جی کی شاعری میں زندگی کی گھن گرج، اس کا جلال و جبروت اور ایک بہتر زندگی کے حصول کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ تازہ ترین غزلوں سے چند اقتباسات دیکھئے

ے

چال حنا کی دھیرے دھیرے اٹھی ہے
کاغذ کا غذ شکلوں کو بھڑکائے گی

دیوی سکھ کی دھرتی دھرتی اتری ہے
آنسو آنسو، بستی کو مسکائے گی

جنگل جنگل، لرزہ لرزہ کانپے ہے
راون، راون سیتا آگ لگائے گی

جیون آشا ہوا ہوا لہرائی ہے
موت سمان خداؤں کو دفنائے گی

اگنی رانی ہونٹوں میں مسکائی ہے
بالی جی کے من میں آن سمائے گی

کاغذی آنکھ میں شیشے کی کھنک جاگی ہے
برف شریان میں شعلوں کی دھنک جاگی ہے

کبھر کے زہر میں ڈوبی ہوئی گہرائی ہوئی
خون کی نوک سے مدہوش پلک جاگی ہے

سوچ کی لاٹ سے جلتی ہوئی اوہام چتا
آج شمشان سے نروان تلک جاگی ہے

آگ لہروں کے تھپیڑوں سے نکھرتی بالی
خوف کے جال میں پتھرائی کسک جاگی ہے

اور یہ جاگنے کا عمل باآئی جی کے اندر بھی ہو رہا ہے اور بیرونی ماحول میں بھی جاگرتی کی لہر اٹھ رہی ہے۔ اور ہمیں اس لمحے کا انتظار ہے جب یہ دونوں (موضوعی اور معروضی) عمل ہم آہنگ ہو جائیں گے، پھر اردو ادب کے رنگ محل میں ایک ایسا زندۂ جاوید شاعر داخل ہو گا۔ جس کی آب و تاب صدیوں تک نگاہوں کو خیرہ رکھے گی۔ اور تب ہی بغاوت کا وہ عمل بھی ظہور پذیر ہو گا۔ جو ایک بڑی تبدیلی کا موجب ہو گا اور ہماری جنتا سکھ کا سانس لے سکے گی، وہ لمحہ زیادہ دور بھی نہیں، صرف شرط یہ ہے کہ اس راہ پر ثابت قدمی سے چلا جائے، جس کی طرف باآئی جی ہمیں لے جانا چاہتے ہیں۔ ہمیں باآئی جی کے لفظوں پر غور کرنا چاہیے یقین کیجیے پھر منزل دُور نہ ہوگی

لہو سے چنیں زندگی کی عمارت — نہ ہوگی ستم کی کبھی اب عبادت
جواں سر سجا دو چوراہے چوراہے — کہ مردہ رگوں سے نہ ہوگی بغاوت
گئے کل کی مٹی ہوا میں اڑا دو — نئی زندگی، نئی صبح سے عبارت

وغیرہ وغیرہ

لخت پاشا
۱۴ر نومبر ۱۹۷۳ء

بیتے لمحے، جلتے دُکھ



قہر کے جال میں میرا اپنا لہُو زندگانی کے ریشوں سے کٹتا گیا
سوزِ احساس نے جب جگایا مجھے زرد چہرے کا ہالہ سمٹتا گیا

برف کے شہر پر اِتنے سُورج گرے کُو بہ کُو پھیل کر لوگ طوُفاں بنے
دیکھ کر یہ سماں ظُلم کا ہر نشاں اپنے ماخذ کی جانب پلٹتا گیا

ظُلمتوں کا نگر فاصلوں کی ڈگر ہر طرف ہر جہت حسرتوں کا زہر
پی کے اِس زہر کو عصر کے قہر کو بانجھ نسلوں کا سینہ بھی پھٹتا گیا

چال کیسی قیامت کی چلنے لگا امن کا دیوتا آگ اُگلنے لگا
نفرتوں کا جہاں لے کے اپنا دھُواں پیار کی راہگذاروں سے ہٹتا گیا

زِندگی مرگ کے پیرہن میں رہے دل نہ مانا کہ جینے کی توہین ہے یہ
زِیست کرنے کو اِتنا میں بے چین ہوا موت کے ہر خدا پر جھپٹتا گیا



برف سے اُٹھتے ہوئے شعلوں نے دی ہم کو خبر
پھر کوئی سُورج اُٹھا اور پھر کہیں اُبھری سحر

دُھند کے پیچھے چھپی ہر چیز واضح ہو گئی
جبر کے بڑھتے ہوئے احساس کا کچھ ہے اثر

ظُلمتوں سے ہار جانا بزدِلوں کا کام ہے
موت کے جادہ سے پلٹی زندگی منہ موڑ کر

ظُلم کے تیرہ بدن پر خوف کی پرچھائیاں
خُون میں ڈوبا ہوا ہے ساعتوں کا ہر نگر

دیکھ لو تم بھی تماشا رات کی تاریکیو
آگ کی لہروں میں آ کر بہہ چلا ظلمت نگر



دیکھ کِتنا نِراش منظر ہے
ٹُوٹتے پاؤں سامنے گھر ہے

کون پُوجا کے پھُول لائے گا
زِندگی اِک اُجاڑ مندر ہے

غم کی دہلیز پہ ہُوئے چھلنی
یہ نہ جانا کہ کانچ کا در ہے

کوئی آ کر ہمیں پُکارے کیوُں
کیا کہیں کس جگہ لُٹا گھر ہے

اب کِسی بات پہ نہیں روتا
اپنے سِینے میں بو یا پتھر ہے



اُداس لمحوں کا ہمسفر ہُوں
خوُد اپنی ہستی سے بے خبر ہُوں

سُلگتے سانسوں کی آنچ لے کر
خوشی کی راہوں پہ چشمِ تر ہُوں

مقامِ عبرت نہ بن سکی جو
شکستہ نسلوں کی وہ خبر ہُوں

کوئی رُکے کیوں صدائیں سُن کر
اُجاڑ مندر کا بیں گجر ہُوں

چلو بھُلا دو میرا فسانہ
کہ بیتے کل کا گیا پہر ہوں



آبادی میں بکھرے ہوئے ویرانوں کا گھر ہوں
خود اپنی ہی اُلجھی ہوئی سوچوں کا اثر ہوں

دو پل ہی ٹھہرنے کو بھلا آئے کوئی کیوں
تنہائی کے جنگل کا وہ بے برگ شجر ہوں

دیکھا نہیں صدیوں سے کوئی بھٹکا مسافر
ابلاغ کو جاتی ہوئی اک راہ گزر ہوں

جو اپنے اندھیروں سے نہ نکلے کبھی باہر
وہ برف میں ڈوبے ہوئے سورج کی سحر ہوں

تم ٹھیک ہی کہتے ہو نہیں دید کے قابل
اُجڑے ہوئے لوگوں کی وفاؤں کا نگر ہوں



میری صورت دیکھ کر حسرت سے کوئی کہہ گیا
بانجھ صدیوں کی نشانی ایک لمحہ رہ گیا

آیا تھا برباد کرنے مجھ کو کتنی شان سے
خود خزاں کا دیوتا بھی میرے غم میں بہہ گیا

لوگ تو نفرت کے سورج کی شعاع سے جل گئے
میرا دل تھا جو محبت کا بھی تیشہ سہہ گیا

آ رہے ہیں پوچھنے وہ میرے ارمانوں کا حال
دل کا ننھا سا گھروندہ آج ہی کیوں ڈھہ گیا

دل کے ویرانے میں کوئی اجنبی جھونکا نہ تھا
دھڑکنیں یہ کہہ رہی ہیں کوئی آ کر رہ گیا



غم سے ایسے بھی تو کترائے گئے
اشک آنکھوں ہی میں پتھرائے گئے

پیار ہیں لگ کے وہ سینے سے میرے
لفظ انکار کا دوھرائے گئے

غیر کو چوم لیا نفرت سے
ہم کو الفت ہی میں ٹھکرائے گئے

لڑکے طوفان سے ایسے ٹوٹے
ہم کناروں سے بھی ٹکرائے گئے

زندگی اُن کی مقابر میں ڈھلی
لوگ جو موت سے گبھرائے گئے



چاندنی بانٹتا چاند بھی تھک گیا
میرے آنگن میں پھر بھی اندھیرا رہا

اپنی تنہائیوں کا کروں ذکر کیا
بن پجاری کے ہوں ایک اُجڑا خدا

موت کی آرزو آرزو ہی رہی
میں نے ہنس ہنس کے ہستی کا دکھ بھی سہا

ایک بھی آنکھ جگ میں نہ پُرنم ہوئی
اتنی عظمت سے میرا جنازہ اُٹھا

مُجھ کو ساحل کی اک وقت تھی آرزو
اب تو طوفاں ہی میرا کنارا ہُوا



غم زدہ ہو گیا ہے اب غم بھی
اے خُوشی ! تیری آنکھ میں نم بھی

چارہ گر سے کہو نہ اَب آئے
زخم بن کر ڈسے ہے مرہم بھی

گھر کے دروازے اجنبی سے لگیں
اپنی پہچان کھو گئے ھم بھی

اپنا احساس مر گیا یارو!
سچے لگنے لگے تواھم بھی

گرچہ خوشیاں ہیں ہم سے دور ابھی
ان سے ہو گا کبھی تو سنگم بھی

کون کھائے فریب صبحوں کے
آج اندھے ہوئے ہیں انجم بھی

کب تلک اور ہم ترستے رہیں
آ بھی جاؤ ہے جانے کو دم بھی



راکھ جو ہم ہُوئے اُڑا دینا
کُچھ تو جلنے کا تم صلہ دینا

رسم پُوجا نہ ہو پجاری کوئی
دِل کے مندر کو یُوں گرا دینا

تجھ پہ رُسوائیوں کے داغ بنیں
ہم کو اتنی تو نہ سزا دینا

جل اُٹھے پھر نہ کہیں نام میرا
یاد کی لوح سے مٹا دینا

لُوٹ کر جلتی ہوئی آنکھوں کو
برف کے زہر میں بجھا دینا



میرے سنگ خاک بسر ہو کہ زمانے کو چُنو
کوئی تو رِیت نِبھانے کے فانے کو چُنو

پیار ہوتا ہے فقط ہار تجھے کیا معلوم
فتح پانی ہے تو اُونچے سے گھرانے کو چُنو

نام پر تیرے بنا گالی ہوا دِیوانہ
تم بھی اوروں کی طرح سنگ اٹھانے کو چُنو

میں زمانے کی طرح سُکھ تمہیں دے سکتا نہیں
درد کے شہر میں بُت میرا سجانے کو چُنو

تُم کو غم ہے کہ اندھیروں کا مسافِر ہُوں صنم
مُجھ کو جُگنو کی طرح راہ دکھانے کو چُنو

پیار پھولوں کی نہیں سیج ہے کانٹوں کا نگر
خوف لگتا ہے تو تم لوٹ کے جانے کو چنو

میں کہ رسوائی کا عنوان ہوں لے ڈوبوں گا
نام کو میرے سجن جی سے بھلانے کو چنو



مر بھی جائیں اگر تو کیا ہو گا
بیش تر آپ کا بھلا ہو گا

ہم کو کر کے برہنہ دیکھ چکے
آپ کو بھی تو دیکھنا ہو گا

وہ جو نخوت سے آج لوٹ گیا
مُجھ کو حسرت سے ڈھُونڈتا ہو گا

ایک دن تجھ پہ وہ بھی آئے گا
جب نہ تو اُپنا آشنا ہو گا

دے کے ہم کو فریب ہستی کے
کیا نہ رویا ۔ کبھی خدا ہو گا



یہ کرم بھی وُہ کر گیا ہوتا
جامِ ہستی جو بھر گیا ہوتا

چھوڑ کر زندگی سے اپنے گلے
میں ہی خُود سے گزُر گیا ہوتا

پا ہی لیتا سِسکتے ویرانے
مجُھ میں کوئی اُتر گیا ہوتا

پلتا سینے میں حسرتوں کا دُھواں
تو بھی جینے سے ڈر گیا ہوتا

مُسکراتے تیری طرح ہم بھی
کاش احساس مر گیا ہوتا



مبارک حیدر کے نام

وہ جو خود میں ہی مر گیا لوگو
ہم کو دیوانہ کر گیا لوگو

آئینہ بھی تڑپ کے چُور ہُوا
اس قدر میں بکھر گیا لوگو

کھُر کے پیرہن میں رہ رہ کر
اپنا اِحساس مر گیا لوگو

مجھ کو پہچان کر کرو گے کیا
خود سے بھی میں گزر گیا لوگو

برف سوچیں ہی میرے ساتھ رہیں
آگ میں میں اُتر گیا لوگو



زخم لہروں کے بھی کھائے یارو
بیچ منجدھار جو آئے یارو

ہر طرف چیختے ہیں سنّاٹے
شہر یہ ہم نے بسائے یارو

جل اُٹھے آنکھ کے بجھتے صحرا
اُس نے جب دیپ جلائے یارو

گھر کے آنگن سے اندھیرا نہ گیا
داغ دل کے بھی جلائے یارو

زندگی کِن کا مُقدّر ہو گی
ہم پہ تو موت کے سائے یارو



گلی گلی میں پکارے لہو اُبلتا ہوا
چلا ہے موت کی ٹوہ میں کوئی مچلتا ہوا

بُریدہ شاخ پہ دیکھا گلاب پھلتا ہوا
خزاں کا دور بھی آیا ہے ہاتھ ملتا ہوا

نویدِ صبح کی بشارت کچھ اس طرح سے ملی
ستم کی آنچ پہ ہر فرد تھا پگھلتا ہوا

میری نظر کی مسیحائی یا حقیقت تھی
مجھے مزار ملا زندگی میں ڈھلتا ہوا

جنوں کی راہ میں ہم تو تھکے نہیں تھے مگر
کسے کہیں کہ رُکا وقت ساتھ چلتا ہوا



کچھ ہم برہم کچھ برہم غم
اب ساتھ اُٹھیں تو کیسے قدم

آئی تھی پوچھنے حال میرا
ہُوئی آنکھ خوشی کی بھی پُرنم

لوگوں سے شِکایت کیا معنی
ہُوئے اپنی جان کے دُشمن ہم

تُم کیا بانٹو گے درد میرا
ہیں روز کی باتیں رنج و الم

احساس نے ہم کو مار دیا
اَب کیسے نبھے سانسوں کا بھرم



غم بھی دھیرے سے مُسکرانے لگا
کیا خُوشی کا جنازہ جانے لگا

ہم چلے جائیں گے گھڑی بھر کو
تُو ابھی سے سِتم اُٹھانے لگا

درد کا ساز دے کے سینے ہیں
کوئی کیُوں ھم کو آزمانے لگا

ہم ہی بھُولے وفا کی راہوں میں
تو عِنایات کیوں جتانے لگا

کیا یہی عشق کا تقاضہ تھا
ہم کو شعلوں پہ تو نچانے لگا



وہ جو ویرانیوں کی مورت تھا
چاند کی طرح خوب صورت تھا

ہم ہی رسمِ وفا نبھاتے رہے
پیار تو آپ کا کدورت تھا

میں خوشی کے فسانے کیسے کہوں
تیرا ہر روپ غم کی صورت تھا

وہ کھلونا بھی آج ٹوٹ گیا
جو کبھی آپ کی ضرورت تھا

اشک جو آج غم سے پتھرایا
درد کے گاؤں کا مہورت تھا



تیری محفل میں یہ کیا کر لائے
خود کو دیوانہ بنا کر لائے

تم پہ اِلزام نہ بننے کے لئے
دیکھ ہم خود کو مٹا کر لائے

مسکراہٹ کے کفن میں ہم تو
لاش اشکوں کی چھپا کر لائے

تم سے شکوہ ہی نہ کر بیٹھیں کوئی
دیپ آنکھوں کے بجھا کر لائے

راہ میں چھوڑ کے گر جانا تھا
گھر سے کیوں ہم کو بلا کر لائے

آنکھ مستی سے مِلانے کے لئے
زہر ہم خُود کو پِلا کر لائے

تُو نہیں وُہ کہ اُجاڑا جس نے
دِل کو ہم اِتنا تبا کر لائے



زندگی اتنی ضروری تو نہ تھی
داستاں غم کی ادھوری تو نہ تھی

پاس پہنچے تو گرے نظروں سے
دور رہ کر بھی یہ دوری تو نہ تھی

نہ رہے اپنے ہی قابل ہم تو
بات اُن کی بھی یہ پوری تو نہ تھی

دیکھ کر زیست میں اپنی صورت
ماتھے پہ موت کے تیوری تو نہ تھی

کون سہتا ہے ستم مرضی سے
چال اپنی بھی شعوری تو نہ تھی



ساتھ چل کر بھی وُہ بیگانے رہے
اپنی قسمت میں تو ویرانے رہے

چل دیئے وہ تو یہ محسُوس ہُوا
آنکھ میں اُن کے افسانے رہے

لُٹ گیا گھر تو نہ رونا آیا
درد کے نام سے انجانے رہے

جلتے ہونٹوں پہ نمی جاگ اُٹھی
مے کی چاہت میں جو میخانے رہے

لوگ دیوانگی میں جیت گئے
ہم ہی پاگل تھے جو فرزانے رہے



تم کسی کا بھی اِنتظار کرو
کون کہتا ہے ہم سے پیار کرو

آ ہی پہنچا ہُوں آج پاس تیرے
مجھ کو میری نظر میں خوار کرو

میری باتیں دغا فریب سہی
اپنی باتوں پہ اعتبار کرو

ساتھ چلنا تمہُیں گوارا نہیں
ٹوٹ جانے پہ اِنحصار کرو

اپنی عظمت کی تسلّی کے لئے
میری ذِلّت کو اشتہار کرو



سانسوں کا ساز دے کر احساس میرا لُوٹا
یہ زِندگی کا شاید مُجھ پر سِتم ہے لُوٹا

لوگوں کے کان میں تو سِیسہ بھرا ہُوا ہے
کیوں دِل کی سرزمیں سے شکوؤں کا شہر پھُوٹا

ہم نے تو موت سے بھی کرنی وفا تھی یارو
کیوں ہاتھ اس کا آ کر ہاتھوں سے میرے چھُوٹا

ہمدردیوں کا مرہم کب تک نہ زہر بنتا
سِینے میں پھل رہا ہے محرُومیوں کا بُوٹا

جِن کے لئے نظر کے دیئے عمُر بھر جلائے
دیکھو تو کہہ رہے ہیں وہی آج ہم کو جھُوٹا



سینے میں لئے تیرا پیار چلے
ہم جیت کے بازی ہار چلے

تو رُسوا نہ ہو بدنام نہ ہو
یہی سوچ کے ہم سو بار چلے

اب آزادی سے لُٹ جانا
ہم موت سے کر اقرار چلے

کیا پُوچھتے تم سے یہ کیا کیا
ہے کافی کہ ہو کر خوار چلے

دُنیا کی شکایت کس مُنہ سے
تیرے بھی تو ہم پروار چلے

ضِد تیری ہی جیتی ہم ہارے
لے چھوڑ بھی دے تکرار چلے

تیرے ساتھ بھی رہ کر کیا پایا
جانا تو نہ تھا ناچار چلے

تیری نفرت زِندہ رہ جائے
ہم اُلفت سے بیزار چلے

اے خِضر مُبارک ہو تُجھ کو
آ دیکھ سُوئے منجدھار چلے



زندگی میں ہی مر گئے ہم لوگ
کیا کہیں خود سے ڈر گئے ہم لوگ

درد کی آڑھی ترچھی راہوں میں
ایسے سمٹے بکھر گئے ہم لوگ

ڈھونڈنے پر نشان بھی نہ ملا
آج ہی اپنے گھر گئے ہم لوگ

آپ کو عظمتیں مبارک ہوں
ذلتوں میں نکھر گئے ہم لوگ

آپ سے محسنوں کی خواہش پر
زہر میں بھی اتر گئے ہم لوگ

آپ شِکووں کا کاسہ لے آئے
خامشی میں بِکھر گئے ہم لوگ

آپ رایفائے عہد لائے جب
خواہشوں سے گزُر گئے ہم لوگ



وقت نے ہم کو اِس قدر لُوٹا
دِل کے مندر کا دیوتا ٹُوٹا

خوُد پہ اَب اعتبار کیسے کریں
تیرا ہر لفظ جب ہُوا جھُوٹا

آنکھ میں ہم نے جڑ لئے پتھر
درد کا ساتھ اِس طرح چھُوٹا

ڈر گیا دیکھ کر میری ہستی
مجھُ سے یُوں موت کا خدا رُوٹھا

کر گیا اِس طرح کوئی گھائل
خُون بھی سانس سانس سے پھُوٹا



میں تو تڑپا ہوں صدا کی مانند
تو ہی بے حس تھا خدا کی مانند

مقبرہ میری ہی ہستی تو نہ تھی
تو بھی مردہ تھا قضا کی مانند

میں تو آتا ہوں تیرے ملنے کو
تو ہی ملتا ہے جدا کی مانند

میں منانے تو نہیں آؤں گا
روٹھتے کیوں ہو خفا کی مانند

میں سمندر کی طرح ہوں خاموش
تو تھا چلاتی ندا کی مانند

مَیں وفاؤں کی صلیبوں کا یقیں
خوش رہے تو ہی جفا کی مانند

آیا رنگوں کا بیوپاری آیا
چل دے بے رنگ ہوا کی مانند

میں تو مجرم کی طرح زندہ ہوں
مل بھی لے مجھ سے سزا کی مانند

تیری تو آنکھوں کے اُجڑے معبد
میں شکستہ ہوں دعا کی مانند

تم ترازو کی علامت تو بنو
مٹ ہی جاؤں گا گناہ کی مانند

تیرے چھونے نے ہے پتھرایا مجھے
چلنا تھا مجھ کو بلا کی مانند

میں ہی ماتم کا مصوّر تو نہیں
تو بھی اُجڑا تھا خلا کی مانند

جانتا ہوں کہ نہیں زندہ تو
مجھ کو مٹنا ہے فنا کی مانند



تُو جو آیا ہے شوالوں کی طرح
مِٹ گیا کوئی خیالوں کی طرح

برف ہونا مجھے منظور نہ تھا
میں بجُھا بھی تو مشالوں کی طرح

اُس کو بھی بات نہ کرنی آئی
رہ گیا میرے سوالوں کی طرح

روتے رہ جاؤ گے مجُھ سے مِل کر
میری آواز ہے نالوں کی طرح

آؤں گا میں بھی کبھی کام تیرے
رکھ ہی لے مجُھ کو حوالوں کی طرح

تم ہی اُجڑے نہیں اِس بستی میں
لُٹ گیا مَیں بھی حیالوں کی طرح

تم جو تارِیخ لِکھو گے اَپنی
بِل ہی جاؤں گا مثالوں کی طرح



اِس نگری میں کیسا سُکھ
بِیتے لمحے جلتے دُکھ

خُوشیوں کی برسات بھی کیوں
سُوکھ چلا اَب جِیون رُکھ

تُو بھی آئے چِیخ پڑے
پہچانا نہ جائے مُکھ

آشا کے مت دِیپ جلا
بانجھ ہوئی بھگوّن کی کُکھ

پتھر آنکھیں چُپ کے ہونٹ
لوگ کہیں مجھ کو ہنس مُکھ



کوئی اُلفت کوئی نفرت کا نشاں
اے دلِ ویران لے آیا کہاں

میرے گھر آئے ہو یارو کس لئے
وحشتیں ہی وحشتیں ہوں گی یہاں

نفرتو! تم تو نہ جاؤ چھوڑ کر
مٹ چکا میری محبّت کا نشاں

پھوڑ ہی دیں آنکھ کے شیشے کو ہم
کر گیا وا جو تھا سینے میں نہاں

درد کے ویراں نگر کو ڈھونڈتا
جا رہا تھا حسرتوں کا کارواں

جس ڈگر پہ اُس کو آنا ہی نہیں
منتظر آنکھیں لئے بیٹھے وہاں

میری چاہت تیری اُلفت کا نقیب
کھو گیا جانے کہاں پر وہ سماں



صُبح کا تارا ہم کو کچھ ایسی شبیہہ دِکھلا گیا
دے کے اُجیارے جہاں کو خُود فنا کو بھا گیا

اپنے ہی پنجے گڑھے ہوں اپنے ہی اَبدان میں
دُور کی کیا بات ہے وہ بھی زمانہ آ گیا

بھُول جائیں ظُلم کی رُت کھا لیں زہریلی ہوا
ہم سے دِیوانوں کو کوئی ایسے بھی سمجھا گیا

مُنجمد بے حِس خُدا تھا جانے کیا اُس کو ہُوا
سِینے سے میرے لگا اور مجھُ کو بھی برفا گیا

دیکھ کر شعلے بھڑکتے آنکھ کے مندر میں آج
گھُر کا کُہنہ پجُاری خوف سے تھرّا گیا

ہم نے تو دیکھیں تھیں یارو! رنگوں کی دیویاں
درد کا اُجڑا شہر پھر آنکھ کو تڑپا گیا

موت کے ہونٹوں پہ رقصاں زندگی کے گیت تھے
دیکھ کر ایسی خوشی کو دل میرا دہلا گیا

چاند تو ڈوبا تھا شب میں یہ بھی دیکھو معجزہ
دیکھ کر میرا مقدّر شمس بھی گہنا گیا

تھا پُجاری ہی خزاں کا جو کہ آج
آنکھ کے ویراں کھنڈر میں حسرتیں بکھرا گیا



وہ جو سورج کی طرح تھا نکلا
ایک پتھر بھی نہ اُس سے پگھلا

میں تو تکتا ہی رہا اُس کو فقط
رنگ اِس طور سے اُس نے بدلا

اُس کو حسرت ہی رہی سننے کی
نہ کہا میں نے بھی کوئی جملہ

راہ پہ زیست کی چلتے چلتے
اور ہی بکھرا میں جتنا سنبھلا

میں تھا کتراتا جہاں جانے سے
لے ہی پہنچا وہیں یہ جی پگلا



لوٹ جائے نہ گھبرا کے چنچل ہوا
جانے ہنستا ہے کیوں آج پگلا خُدا

میں نے سایوں کو ڈھونڈا تو صحرا ملے
اِس کڑی دھوپ میں ہو کوئی آشنا

آپ تو میکدے میں بھی اُجلے رہے
ہم ہی مارے گئے خواہ مخواہ بیگناہ

آپ تو ظلم کی زندہ تصویر ہیں
کون مانگے بھلا آپ سے آسرا

اِس کو بھی کچھ تڑپنے کا احساس ہو
آج پیاسا رہے دوستو مے کدہ



خواہشوں کے لئے یہ دہر نہیں
تیرگی کی جبیں پہ مہر نہیں

آنکھ میں جلتی آرزوئیں ہیں
درد کے ناگ تجھ میں زہر نہیں

حسرتوں کا مزار مت پوچھو
اجڑے لوگوں کا کوئی شہر نہیں

آج کیوں خامشی سے گزرا تو
تیرے ترکش میں کوئی قہر نہیں

زندگی نے ہمیں سکھایا یہی
غم کے آنے کا کوئی پہر نہیں



بُجھ گیا چاند گھٹاؤں کے سبب
لُٹ گیا پیار وفاؤں کے سبب

صدیوں سے سوچ میں ہوں ڈوبا ہُوا
اُجڑا ہُوں کس کی اداؤں کے سبب

درد کا دیپ بجھا چاہتا تھا
جل اُٹھا ان کی جفاؤں کے سبب

جان تو پیار نے لے لی یارو
اُڑ گیا گھر بھی ہواؤں کے سبب

مر گیا سوچ کا مجُرم سُن لو
اَندھے بے بہرے خُداؤں کے سبب

اُس کو پہچان نہ پائے ہم بھی
آنکھ میں ٹھہرے خلاؤں کے سبب

لوگ گرتے گئے زمیں کی طرف
زہر میں بجھتی فضاؤں کے سبب



ساحل سے بے نیاز بھنور میں سما گئے
ہم کیا کہیں کہ آپ کی نظروں میں آ گئے

آئے تھے دو گھڑی کے لئے میرے پاس وہ
آنکھوں کو شہرِ برق کا نقشہ دکھا گئے

ہم اب بھی خود کو ڈھونڈ رہے ہیں خلاؤں میں
کچھ اِس طرح وہ ہم کو نظر سے گرا گئے

ہم بھی کبھی تھے اُن کی محبّت کی آرزو
جو آج بے رُخی سے نِگاہیں چُرا گئے

وہ میرے پیار اپنی اَداؤں کے کھیل کو
ماضی کا کوئی خواب سمجھ کر بھلا گئے



بانجھ پن میرا مقدّر زندگی سنسان ہے
وقت کے ہونٹوں پہ دبکا موت کا اعلان ہے

ڈھونڈتے کیا ہو بتاؤ تم بدن کے غار میں
سانس کی جلتی چتا کا آنکھ میں شمشان ہے

کاغذی خوشیوں پہ نازاں ہوں اگر تو کس لئے
غم کی سنگینوں کی زد میں آج بھی انسان ہے

معجزہ اس کو کہوں یا اپنی نظروں کا فسوں
پتھروں کی آنکھ میں پھیلا ہوا طوفان ہے

کون ہے خود آج اپنی لاش پہ ماتم کناں
کس کے ہونٹوں پر مچلتی موت کی مسکان ہے



سنگینوں کے شہر مجھے کچھ کہنا ہے
ڈھا لینا پھر قہر مجھے کچھ کہنا ہے

سکھ کی باتیں افسانوں کا شہر ہوئیں
دکھ کے جلتے پہر مجھے کچھ کہنا ہے

روشنیوں میں بھی اندھیارے جلتے رہے
سن صبحوں کے دہر مجھے کچھ کہنا ہے

راج ترے میں تارے ڈوبے دن نہ ہوا
بجھ گیا جلتا مہر مجھے کچھ کہنا ہے

تو حاکم انجام میرا مقتل ہی سہی
اے زہریلی لہر مجھے کچھ کہنا ہے



میں نے انسان میں بھگوان کی چھب دیکھی ہے
پیار میں بھیگی ہوئی شان کی چھب دیکھی ہے

بھو کی نظروں کے ترازو میں جو تلتی ہی گئی تلتی رہی
اُسی عصمت میں لٹی آن کی چھب دیکھی ہے

ظلم کے گاؤں بھے دل کی جبیں کیسی کتھا
زہر میں بجھتے ہوئے بان کی چھب دیکھی ہے

زر کی وادی کے گنہگار خداوندو سنو
میں نے ہمینت پہ لگے کان کی چھب دیکھی ہے

اے مہا پرش کھلی آنکھ سے گر دیکھو تو
تیری روتی ہوئی سنتان کی چھب دیکھی ہے

سوگ میں ڈوبی ہوئی زہر صلیبوں کی قسم
شہرِ ماتم تیرے دربان کی چھب دیکھی ہے

آج پھر پیار کی بستی میں دھماکا سا ہوا
اُسی دوپہر کے مہمان کی چھب دیکھی ہے

آج میں پستے ہوئے کاغذی اِنسانوں کی
ضبط میں مرتی ہوئی جان کی چھب دیکھی ہے

ظلمتِ شہر پہ ہے طاری نِزاع کا عالم
جانے سورج تلے زِندان کی چھب دیکھی ہے

کوئی راون کے مقدّر کی طرح مسخ ہوا
میں نے یوں جہل کے عرفان کی چھب دیکھی ہے

اب تو جیون بھی کبھا رنگ ہوا جائے ہے
میں نے ہر گام پہ شمشان کی چھب دیکھی ہے

برفزاروں کے مقدّر کی طرح بے حس ہیں
کس نے شعلوں پہ یہ بُہتان کی چھب دیکھی ہے



نگاہوں میں شعلے پروئے تو جانا
دھواں رہ گیا ہے ہمارا ٹھکانا

محبت سے ہم نے جو باہیں پھیلائیں
تو نفرت کا دل پہ لگا تازیانہ

کوئی بارہا مجھ سے پوچھے یہ آ کر
کہاں کھو گیا ہے ترا مسکرانا

اندھیری امیدیں ہمیں اک کہانی
امنگوں کے خوں سے مقدر جلانا

جہاں رسم پوجا نہ کاہن کے پہرے
خلاؤں کے معبد میرا آشیانہ



لخت پاشا کے نام

ہو گیا خُود سے بھی جُدا لوگو
تھا جو سب کے لئے دُعا لوگو

پیار کی بستیاں اُجڑنے لگیں
اب نہیں کوئی راستہ لوگو

روشنی کے جنوُں میں اندھے ہوئے
دِن بھی کہنے کو یوُں چڑھا لوگو

دِل کی دُنیا میں پھر خلا جاگا
کون محفل سے یوُں اُٹھا لوگو

رات کے ہونٹ سے خُوشی پھُوٹی
صُبح کا تارا بھی مر گیا لوگو



اُجڑے ہوئے یہ سینے ہیں بھی اَرمان تھا کبھی
صحرا میں ڈھل گیا ہے جو طوفان تھا کبھی

محرومیوں کے تیر چلاؤ گے اَب کہاں
پتھرا گیا وہ شخص جو اِنسان تھا کبھی

سوچوں کے گہرے غار ہیں وہ بھی لُڑھک گیا
جو بے کسی کے نام سے انجان تھا کبھی

خود چیخ بن گیا ہے جو اپنے وجود کی
تیرے گلاب ہونٹوں کی مُسکان تھا کبھی

زِندہ رہوں گا زِیست پہ اِلزام کی طرح
اَب کیا کہوں کہ اِتنا بھی نادان تھا کبھی



برف کا شہر اور میری چُپ
آس کی لہر میں گھنیری چُپ

کب سے بیٹھا ہُوا یہ سوچے ہُوں
مرگ کا ساز ہُوئی تیری چُپ

بات کرتی کسے نہیں آتی
لُوٹ کر لے گئی اندھیری چُپ

سامنے آئے موت میں اُترے
آج کے پہر میں دلیری چُپ

آ بھی جاؤ صنم نہ ڈرتے رہو
ہم نے ہر گام پہ بکھیری چُپ



خزاں آ کے ہم پہ نہ کیوں مُسکرائے
بہاروں نے آنکھوں کے منظر بُجھائے

سِتاروں نے سانسوں میں پتھر پروئے
ہمارے لبوں کے جو در تھرتھرائے

کبھی چُپ کی سنگت نے آنکھیں دکھائیں
کبھی ہم نے لفظوں کے سائے اٹھائے

جہاں ہم نے شُعلوں کی پرواز چاہی
وہیں برف کے جال اُس نے بچھائے

حقیقت کے پتھر سے کرچی ہوئے جو
ہمیں نے تھے شیشوں کے مندر سجائے



لوگ کہتے ہیں یارو کہ کیا مر گیا
درد جاگا خوشی کا خدا مر گیا

سوچ کے آسماں کو جو دیکھا دھُواں
طرب بزموں کا سارا نشہ مر گیا

ذہن کے بادلوں کو پریشاں کرد
پھُونک دو کشتیاں ناخدا مر گیا

ہم کو جیون کی چاہت بھی کانٹا لگے
گوپیاں چیختی ہیں پیا مر گیا

آنکھ سے زندگی کے اشارے کریں
سانس کی دھڑکنوں کا شبہ مر گیا

ظُلم بستی میں کہُرام برپا ہوا
ضبط کا بے نوا سِلسِلہ مر گیا

نفرتوں کی اَدائیں جو دیکھیں حسیں
پریت کا دیوتا تھا بجا مَر گیا



آگ کی دھار پہ چلنا سیکھو
اپنے ہی خون سے جلنا سیکھو

غم کے ماخذ سے اگر ملنا ہے
درد کے گاؤں میں ڈھلنا سیکھو

اپنی پہچان اگر کرنی ہے
شمس کی طرح نکلنا سیکھو

آج بھی صبح سے اگر اُلفت ہے
شمع کی طرح پگھلنا سیکھو

فتح کا نام اگر پانا ہے
رنگ چہرے کا بدلنا سیکھو



برکات شہید کے نام

دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا
شمس اندھا ہُوا دِن سیاہ ہو گیا

کاٹ کر عصر کے تُند ہاتھوں کو میں
آگہی کے نگر کا خُدا ہو گیا

تُو کہ ہستی میں بھی نیست ہو کر رہا
مَیں فنا میں اُتر کر بقا ہو گیا

ہم اندھیروں میں اب بھی بھٹکتے ہیں کیوں
صُبح کا تارا تو کب کا فنا ہو گیا

مصلحت کے مُصوّر تو جاگے کا کب
ظُلم پہلے سے بھی اب سوا ہو گیا

دیکھ کر میرے رنجیدہ چہرے کو کیوں
رنگ خوشیوں کا یارو ہوا ہو گیا

ظُلم کی رات تھی جہُل کے رُوپ میں
فرض اپنا بھی لیکن ادا ہو گیا



سِتم کے نگر میں کرا دو مُنادی
کہ ہم نے چوراہے میں تربُت سجادی

لہُو رنگ خاکے میں ڈھلتی گئی وُہ
اندھیری سحر کو جو ہم نے سزا دی

ہمیں صبر کے راستوں پہ نہ ڈالو
کہ ہم نے مُقدّر کی بَستی اُٹھا دی

کہو موت کی شام سے آج نِکلے
کہ ہم نے صلیبوں پہ ہستی لُٹا دی

ذرا سوچ کر ہم سے آنکھیں مِلانا
کہ ہم نے مُروّت کی عادت بُھلادی



میں نے کب کہا سجن رات غم کی کٹ گئی
آ کے میرے دوار سے روشنی پلٹ گئی

کوئی کیا جواب دے اَب تیرے سوال کا
آج میری آنکھ میں خامشی سمٹ گئی

زندگی کے قہر سے ڈر کے بھاگتی ہوئی
موت کی اُداس شام مجھ سے آ لپٹ گئی

کیا کہوں میں ساتھیا رائیگاں کی دُھوپ جو
ڈس کے میری خواہشیں کرچیوں میں بٹ گئی

ماتموں کا ساز کیوں حسرتوں کی لاش پر
سانس کا چراغ تھا درد رُت اُلٹ گئی



پلکوں کی سنگین اُٹھاؤ
ظُلم خُداؤں کو تڑپاؤ

آگ دھویں کا راج امر ہو
یُوں شعلوں کے شہر بساؤ

برف کے سینے میں سُورج ہو
کچھ ایسا ہی رنگ جماؤ

آزادی زنجیر ہوئی ہے
دار نگر میں دُھوم مچاؤ

موت نے پسیح کو پھر سے پُکارا
بالی جی تُم توڑ نبھاؤ



مسکراہٹوں کا رنگ اِس قدر مچل گیا
میں پلک پلک تلک آنسوؤں میں ڈھل گیا

آج کیوں صدائیں دوں رحم کے خداؤں کو
میرا اعتقاد تو حرف حرف پگھل گیا

سانس سانس آگ ہو اب یہی ہے آرزو
میں قفس قفس اجاڑ برف سے نکل گیا

میری آنکھ کے خلا ویراں گر ہوئے تو کیا
زندگی کے گاؤں سے کب کوئی سپھل گیا

جس کو دیوتا سمجھ من میرا جھکا کبھی
بالی جی وہی اُسے پیار سے کچل گیا



رونے کے لئے ہم نے خُدا ڈھونڈ لیا ہے
اَب تم ہی کرو فیصلہ کیا ہم نے کیا ہے

اِنکار کی سیڑھی پہ کھڑا سوچ رہا ہُوں
اِقرار کا پتھر بھی میرے پاس پڑا ہے

آنکھوں سے پگھلتے ہُوئے شیشوں کے بہاؤ
شعلوں کی جلی لاش پہ ماتم سا بَپا ہے

اَب خاروں کے زخموں کا گِلہ کاہے کریں ہم
سینوں سے بہاروں کا جنازہ ہی اُٹھا ہے

ہونٹوں پہ دبی سانس تو پہلے ہی تھی خاموش
ماتھے پہ دھڑکتا ہُوا سُورج بھی بجُھا ہے

آنکھوں میں نِراشا کے دِیئے گرچہ ہیں روشن
من میں تو مِرے آس کا اَستھان رہا ہے

دم توڑتے صُبح کے سِتارے نے خبر دی
راتوں کے مُقدّر میں سویروں کی ہَوا ہے

○



مِنتوں کے آسماں کو خُدا جان لیا تھا
کیوں تشنگی کا خوف دُعا مان لیا تھا

پتھرائے مندروں سے نہ تو آ سکا صنم
ہم نے تو ہستیوں کا دُھواں چھان لیا تھا

پلکوں میں برچھیوں کا نگر جاگتا رہا
دِل نے خموشیوں کا نشہ تان لیا تھا

روشن سیاہ رات کی پائل ہے چُور چُور
کلہے کو ساتھ موت کا سامان لیا تھا

سوچوں کی دھڑکنوں کا جہاں چھانتے ہوئے
اِس دِل نے پتھروں سے بھی تاوان لیا تھا

ویرانیوں کے جال نے تانے بُنے مگر
رستے میں بستیوں نے مجھے آن لیا تھا

بالی حقیقتوں کا نہ ادراک ہو سکا
اُجڑے مُقدّروں کو تو پہچان لیا تھا

○



تُلے موت رانی عِوض زِندگی کے
لہُو کے جزیرے وطن آشتی کے

کہُر کے قفس سے صدا ایک اُبھری
ہیں سُورج کے سر پہ گِلے روشنی کے

لِکھا تھا بہت کچھ ہی لمحوں کے مُکھ پہ
نظر رہ گئی کیُوں نگر بے بسی کے

جو ریشم کی دھاروں سے ٹپکے پسینہ
لہُو رو گئے ہیں بدن آدمی کے

جہاں چُھپ کے آنچل نے سائے بچھائے
قدم شل ہوئے کیُوں وہیں آگہی ہے



لہو سے چُنیں زِندگی کی عمارت
نہ ہوگی سِتم کی کبھی اب عبادت

جواں سر سجادو چڑھا ہے چڑھا ہے
کہ مُردہ رگوں سے نہ ہوگی بغاوت

سِتم کو ہے کاٹا سِتم سے ہمیں نے
ہمیں تو کبھی آ سکی نہ شرافت

کوئی بادشاہ کوئی دار و رسن پر
یہ اِنساں ہی اِنساں میں کیسا تفاوت

گئے کل کی مِٹی ہوا میں اُڑا دو
نئی زِندگی نئی صُبح سے عبارت



چاندنی کے شہر پہ تاریکیوں کا راج تھا
رات کے شمشان گھر میں شمس کا اِندراج تھا

سبز رُت کی کونپلیں یہ دیکھ کر مُرجھا گئیں
بانجھ نسلوں کا جزیرہ دُلہنوں کا داج تھا

روشنی کے سُورجوں کی ہر شعاع اپنی نہ تھی
ایک ذرّہ ہی ہماری محنتوں کی لاج تھا

پیار کی بیدار راہوں کے اُجالے کھا گئے
ظُلمتوں کی سرزمیں کا ہر قفس تاراج تھا

بے حسی کی دُھوپ تھی ہم معجزہ سمجھے جسے
باکی سوچوں کے لہُو میں آگہی کا تاج تھا



برکھا برکھا نظر ایسے مُسکا گئی
شعلہ شعلہ جبیں زندگی پا گئی

پتھروں کے بدن میں دراڑیں پڑیں
چُپ کی آنکھوں میں یُوں روشنی آ گئی

صبح کی کرنیں سُنائیں فسانے نئے
رات سُورج کے آنگن میں شرما گئی

خوف نے جال نکتوں کے لاکھوں بُنے
آگہی سب لکیروں کو بکھرا گئی

ہم نے ہاتھوں میں تیشے اُٹھائے نہیں
ظلم پیکر کی دھڑکن کیوں پتھرا گئی

زِندگی کے نگر سے شرارے اُٹھیں
سبزہ سبزہ ہوا آگ برسا گئی

موج کی آنکھ میں گاڑ دو برچھیاں
ساحلوں کے نِشاں آشتی کھا گئی

بانجھ صدیوں نے ریزہ فصیلیں چنیں
خُشک بالی کے مُکھ پہ نمی چھا گئی



دُھوئیں آگ میں کیسے شِکوے گِلے
لہُو کے نگر آشتی میں جلے

جلُو میں تباہی و کہُرام لے کر
سِتم اژدھے موت رہ کو چلے

کبھی رات میں بھی نہ تھمتے تھے جو
وہی اشک شعُلہ سحر میں ڈھلے

بغاوت بغاوت دھڑکنے لگے
روایت کی کہُنہ گلی میں پلے

دبی آنکھ میں مُسکرائے ہنسے
ادا روشنی کی لہُر کے تلے

غموں کی چٹانوں سے رِستے ہوئے
ہمیں مُسکراہٹ کے جھرنے ملے

اندھیروں کی دھرتی پہ چھانے کو آج
بالی جی سانسوں میں سُورج پھلے



ریزہ ریزہ سُورج کو چمکائے گی
قطرہ قطرہ شام لہُو برسائے گی

چال حنا کی دھیرے دھیرے اُٹھی ہے
کاغذ کاغذ شکلوں کو بھڑکائے گی

نیلی آنکھیں، لالی لالی جاگی ہیں
اندھی روشن رُت جیسے پتھرائے گی

دیوی سُکھ کی، دھرتی دھرتی اُتری ہے
آنسو آنسو بستی کو مُسکائے گی

جنگل جنگل لرزہ لرزہ کانپے ہے
راون راون سیتا آگ لگائے گی

جیون آشا، ہوا ہوا لہرائی ہے
موت سمان خداؤں کو دفنائے گی

اگنی رانی ہونٹوں میں مسکائی ہے
باگی جی کے من میں آن سمائے گی

○

قطره قطره شام



آنکھ کے دائروں میں سمٹا ہُوا
درد کا شہر مُسکراتا تھا

دِل کے سنّاٹے کر گئے پتھر
ورنہ رونا ہمیں بھی آتا تھا

میری ویرانیاں نہ دیکھ سکا
چاند بدلی میں چھُپا جاتا تھا

جو حقیقت میں ساتھ چھوڑ گیا
خواب میں مجھ کو کیُوں بلاتا تھا

مَن کے مندر کا بُجھتا دیپ کوئی
درد کی آنچ پہ جلاتا تھا



میں نے اشکوں سے جو تراشا بدن
قہقہہ رنگ ہو کے جلنے لگا

دل، کہ پتھر تھا ایک مدّت سے
درد کی آنچ سے پگھلنے لگا

پھر کوئی حادثہ نہ پیش آئے
سانس کیوں تیز تیز چلنے لگا

موت ہی اب نہ ہو کنارا کہیں
صبر میرا جنوں میں ڈھلنے لگا

لب پہ بے ساختہ ہنسی جاگی
شاید ارماں کوئی نکلنے لگا



الوداع دوستو الوداع ساتھیو
ہم تمہارے ہیں رہنے کے قابل نہ تھے

تم کو کیسے بھلا ہم دکھاتے خلوص
ہم کسی کی اُمنگوں کے قابل نہ تھے

کیوں نہ اپنی نگاہوں سے گرتے بھلا
ہم کسی کی وفاؤں کا حاصل نہ تھے

خار نظروں نے اُن کی بتایا مجھے
سبز قدموں سے میرے وہ غافل نہ تھے

آپ کی آنکھ سے ہیں رواں اشک کیوں
آپ تو میرے جرموں میں شامل نہ تھے



نفرت سے الگ اُلفت سے جُدا
ہم دیار کوئی اپنائیں گے

دِل تڑپ تڑپ کر مر جائے
تیرے دوار کبھی نہیں آئیں گے

تم دیکھو گے اِک دن حسرت سے
ہم بیگانے بن جائیں گے

لِا پھول نہ کوئی گلشن سے
کانٹوں ہی سے گھر کو سجائیں گے

آئی نہ حقیقت راس ہمیں
خوابوں ہی سے جی بہلائیں گے

لیا اپنے ہی ہاتھوں خود کو مِٹا
اب اور وہ کیا منوائیں گے

ہر جذبے سے ہو کر ہم خالی
سوچا ہے کہ اب پتھرائیں گے



رحم کے تیر نہ چھوڑو ہم پر
ہم ہیں نفرت سے بہلنے والے

تم جلانا نہ اُمنگوں کے دِیئے
لوگ ہیں رُوپ بدلنے والے

نفرتوں کا نِشان ہوں گے کبھی
پیار کے پھُول مَسلنے والے

زہر میں بُجھتے چلے جاتے ہیں
تیری محفِل سے نکلنے والے

ایک ہنگامہ ہُوا کرتے تھے
شہرِ خاموش میں ڈھلنے والے

برف سے مثلِ شرر اُٹھیں گے
درد کے گاؤں میں پلنے والے

ہم نے پتھراتے ہوئے دیکھے ہیں
آگ کی دھار پہ چلنے والے



لوگ تو ہیں خوف کے زِنداں میں بند
خود ہی اپنی لاش پہ ماتم کریں

پا چُکے ہم زِندگی کے راز کو
پتھّروں سے کیوں نہ اب سنگم کریں

ہو بھی جائے زِندگی کی سانس شَل
آؤ غم کو اور کچھ برہم کریں

بھُول جائیں زِیست کا جَلتا چراغ
تِیرگی کو آج پھر ہمدم کریں

جَل نہ جائے ظُلم کی دُنیا کہیں
سوچ کی لَو اور کچھ مدھم کریں



زنجیریں پگھلا کر کوئی نس نس میں
آزادی کے گیت سنانے آیا ہے

محکومی کے چاند سجا کر آنکھوں میں
کوئی ہماری آس بندھانے آیا ہے

ماتھے پر اندھے شمسوں کا نور لئے
کوئی ہمیں منزل پہنچانے آیا ہے

سنگینوں میں پھول پرو کر خوشیوں کے
کوئی ہمارا درد مٹانے آیا ہے

ہونٹوں پر سجری مہکار گلابوں کی
کوئی ہماری پیاس بجھانے آیا ہے



آگ کی کشتی کی منزل راکھ کیوں
سوچ کی منجدھار کا ہر پل کہے

پھٹ پڑیں گے ایک دن آتش فشاں
چیختی چپ چاپ کی ہلچل کہے

گوری چتون پر پھری برہن لکیر
کاری انکھیوں کا اُڑا کاجل کہے

خون کی لہروں پہ مسکن ہے میرا
آشتی کا ٹوٹتا ساحل کہے

خونچکاں تاریک نگری دیکھ کر
روشنی لاؤں کہاں سانول کہے

آئینے میں جو دِکھائے آئینہ
شہرِ بانی اُس کو کیوں پاگل ہے



نفرتو آؤ گلے سے مِل لیں
پیار کا مرتا نشہ دیکھا ہے

حسرتو ابھرو ابھی جانا نہیں
میں نے پھر خود کو بُلا دیکھا ہے

آج بھی تم ہی میرے سامنے ہو
یاد کو تیری بھلا دیکھا ہے

زندگی تیرے مقدّر کی قسم
موت کا میں نے خدا دیکھا ہے

برف ہوں پھر بھی کھلی آنکھوں سے
درد کو ہوتے سوا دیکھا ہے

کِرن کِرن اُجالے

لمحوں کا دُکھ

ایک لمحہ،
کئی صدیوں میں بکھر جاتا ہے،
جب کبھی گزری ہوئی کل کا خیال آتا ہے،
کل !!
کہ دامن میں چھپائے ہوئے مُردہ لمحے،
وقت کی قبر میں دفنا کے جنہیں بھول گئے،
برف کے کوہ بنے اُبھرے ہیں،
آج کے چہرے پہ ہیں،
مرتے ہوئے چاند کی لاکھوں کرنیں،
یاس و اُمید کے سنگم پہ کھڑی سوچتی ہیں،
صُبح کی پہلی کرن،
ان کا جنازہ ہو گی !!!

انتظار

تیری گلیوں میں بھی آ کر
اِس قدر ڈرتے رہے
مُنتظِر لمحے کی مانند
زِندگی کرتے رہے

زرد پتّے

خزاں کے مارے،

یہ زرد پتّے،

بکھر کے جانے کدھر کو جائیں ؟

کسے بلائیں ؟

کوئی نہیں ہے،

جو اس جہاں میں،

یہ زرد پتّے،

گلے لگالے،

بریدہ ٹہنی پہ گُل کھلالے !!!

تلاش

ڈُھونڈنے نکلو !
تو مِل جاؤں گا ،
کہیں نہ کہیں !
کاغذی پھُول ہُوں ،
رنگوں سے ،
مُبّرا تو نہیں !!!

خامشی

دِل کے سناٹوں کے آگے،
رات کی چُپ،
کچھُ نہیں!!

اِدراک

تیرگی کے آسماں پر
خُون کی روشن لکیر،
پھیل کر
صبح کا اُجالا ہو گئی!!

زندگی

رقص ہے،
زِندہ لاشوں کا،
لاشوں کی کچُھ خواہشوں کا!

تجربہ

دوستی کی آنچ سے
میرا نشیمن ،
جل گیا !!

احساس

لُٹتے ہی رہے ہر بار
مگر تیرا پیار چبھن تھا
کانٹا رہا
کہیں کِس سے بھلا
مانے گا کوئی
احساس کا من میں گھاٹا رہا
دُور تجھ سے رہُوں، اور زِندہ رہُوں ؟
اِک کہانی تھی
دِل میں وِیرانی سے پہلے
جوانی سے پہلے

ہوا آئی غم کی بِکھرنے لگی
خزاں کے بدن میں نِکھرنے لگی
ایک راہبہ بنی
اور ننگی حقیقت کی مانِند جلی
تھی وہ رُت من چلی

صداقت

دیویاں ظُلم کی حسُن پیتھر لئے
آگئیں پیار کا
رُوپ بھرتے ہُوئے!
چال چلتے ہُوئے
تم امُیدوں کے پھُولوں کو
چُننا ہنہیں
خواب بُننا ہنہیں
دیویاں ظُلم کی پیار کی تیغ ہیں
نفرتوں کے زہر کو سموئے ہُوئے

غم پروئے ہُوئے
کاٹ دیں گی جگر کو تمہارے سُنو،
نہ اُمیدیں بُنو،
کہ اُمیدیں
اَجل کا ہی اِک نام ہیں
درد کی شام ہیں!!!

مصلحت

بے حسی کا تاج سر پہ
لب پہ خاموشی کے گیت
کان میں
گالے رُوئی کے
تَن میں سانسوں کی چبھن
میں نے دیکھا
زندگی کو اِس طرح بھی
موت کے احرام میں !!!

دیش نکالا

تم خوشیوں کے نغمے ڈھونڈو

میں خود پر بھی

بَین

لمبی ہو گئی رَین!

میری تیری

سوچ جدا ہے

میرے تیرے

خواب الگ

میں تو ٹھہرا پریم پجاری

تم نفرت کی مالا

دے دو دیش نکالا؟

خدا کی بستی

حنوط شدہ
لاشوں کا مسکن
ٹھٹھری امنگوں کی مہکار
لوگ کہیں جیون سنسار!

بشارت

چیختی،
چنگھاڑتی،
پاگل ہوا،
آ رہی تھی چار سو،
دُور ویرانے میں اک چھپر گرا،
وقت نے نعرہ دیا،
آسماں پر جو خدا تھا،
مر گیا !!!!

آرزو

بندر بدن میں
ہے آدم مقید
کوئی آ کے
اس کو رہائی دلائے
کہ یہ مُسکرائے
!!

سوداگر

خشک لہو کا
ہوں بیوپاری
پیلے چہرے بیچوں گا
لفظوں کا دُکھ
سینچوں گا!!!

ریزہ ریزہ گیت



پریت کی ریت سجنوا آج نبھائی نا ہنہ
آشا کی چھب مَن درپن کو بھائی نا ہنہ

میں پاپن تھی مُنہ کالا کر دُور بھئی
اپنے ہی کرموں سے بھگون چور بھئی
لاج کی ماری شرن تمہارے آئی نا ہنہ
آشا کی چھب ------------

آنسوؤں پیتی اک یُگ سے میں جنم جلی
پیتم کی نگری سے کتنی دُور چلی
برہا کا دُکھ میں ہونٹوں تک لائی نا ہنہ
آشا کی چھب --------

آج کدھر پھر ہیمنت کا سنگیت اُٹھا
سپنوں کی گلین سے بسرا میت اُٹھا
مَن بگھیا کی کلی کوئی مُسکائی نا ہنہ
آشا کی چھب --------



برہن اکھیاں روئیں کیوں
دُکھ دُکھ آس ڈبوئیں کیوں

ریزہ ریزہ گیت کے جال
بکھرے بھٹکے میت سنبھال
ساگر ساگر کھوئیں کیوں
دُکھ دُکھ آس -----

چُپ نیّن سے بولوں گی
پریتم کے سنگ ہولوں گی
آنسوؤں پیاس بھگوئیں کیوں
دُکھ دُکھ آس -----

من مندر پہ گھور کی چھایا
درپن درپن داغ کی مایا
تن میں یاس پروئیں کیوں
دکھ دکھ آس -----

چُپ گھونگھٹ کس کارن ری
بُجھتی رین بھکارن ری
سکھ آنچل میں سوئیں کیوں
دکھ دکھ آس -----



دُکھ مندر کی داسی ہُوں میں
انتر گھٹ تک پیاسی ہُوں میں

آشا کا استھان ملے نا ہنہ
انسوَن کو نروان ملے نا ہنہ
خوشیوں کی بن باسی ہُوں میں
انتر گھٹ----------

شام سمے کی مرنے آئی
درپن ارپن کرنے آئی
تجھ بن شام زراسی ہُوں میں
انتر گھٹ---------

سُکھ مُسکان کو جانوں کیا
تجھ بن چھایا مانوں کیا
ساجن گھور اداسی ہوں میں
انتر گھٹ ---------

آئی بسنت کھلیں ناہنہ کلیاں
تجھ بن سونی سونی گلیاں
دیکھ ملن کی آسی ہوں میں
انتر گھٹ --------

اگنی رُوپ بھی بھر سکتی تھی
ساجن یہ سب کر سکتی تھی
بالی جی چپ واسی ہوں میں
انتر گھٹ -------



تو نے جانا، میں نہ جانی
ساجن کیسی پریم کہانی

دُکھ دُکھ پاؤں ٹوٹ گئے
تم کس گاؤں رُوٹھ گئے
میں پگلی، برہن دیوانی
ساجن کیسی ------

یُگ یُگ ارپن کرتی آئی
دَھک دَھک دھڑکن ڈرتی آئی
تجھ کو چاہا۔ کی نادانی
ساجن کیسی ------

چتون پہ لٹ شور مچائے
پیتم کُہرا بھور ستائے
تو نے کرنی تھی من مانی
ساجن کیسی ------



پگلے لوگ نا ہنہ جائیں ڈر
دُکھ مُسکائیں ہونٹوں پر

سُونی سونی گلیوں میں
کاغذ کاغذ کلیوں میں
کب جاگیں گے خوشبو گھر
دُکھ مُسکائیں -----

بیتے یگ کا ساز ملے
ہو ہو آواز ملے
من مندر میں جھانکیں گر
دُکھ مسکائیں ---

تم نا ہنہ آؤ میں آؤں گی
پتھر پتھر ٹکراؤں گی
بڑھنے لگی اب آس ڈگر
دُکھ مسکائیں-----



رنگوں کے سنگ اڑیں الہڑ کہانیاں
پیتم کی ڈور پہ پیت کی نشانیاں

گڑیا کے سر سے چنریا اڑائیں گی
گڈے سے راجہ کو من میں بسائیں گی
بچپن کے ہالوں سے تکتی جوانیاں
پیتم کی ــــــــــــ

نینوں میں کجلوں کے سپنے سجائیں گی
ماتھے پہ ڈولے کا ٹیکہ لگائیں گی
کر کے سنگھار اٹھیں جوبن کی رانیاں
پیتم کی ــــــــــــ

چنچل پو نّوا کو گھنگھرو بنائے کے
بدرا کے انگنا میں میلہ لگائے کے
ناچیں گگنوا پہ کلیاں سہانیاں
پیتم کی ــــــــــــ

[ام جھرلیا]

لاہور شہر دے اینگلے، نویکلے تے نڈر شاعر

باؔلی جی

دیاں پنجابی نظماں، غزلاں تے گیتاں دا مجموعہ

اکھراں دی چھاتی

جنہاں دا قلم

ہسدے ہنجو، روندے ہاسے، بھکیاں سدھراں
ٹردیاں پھردیاں لاشاں توں کجھ دے کرتے لاہندا
چم دی تانیں چدّر چوں سکّے جھّتے وخاندا

تے

دکھاں دے ہنیریاں نوں لیر لیر کردا
سکھ سنہوڑا دیندا

(چھیتی چھپ رہیا ایہ)

لوکاں دے چھیڑے چھانجے لوکاں دی اپنیں بولی وچ

لوک کلا پبلیکیشنز احاطہ اسلام دین لنڈا بازار لاہور